نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

جلد: ۳۰ | شمارہ: ۴ | اپریل ۲۰۱۷ء | جمادی الثانی۔رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

editor@rafeeqemanzil.com

04 وطن دوستی اور وطن دشمنی۔۔۔۔۔ — احسن فیروزآبادی
08 ناموس عورت اور فسطائی طرز عمل — جویریہ ارم
11 لال فسطائیت
13 ہندوتوا فاشزم اعلی تعلیمی اداروں میں — کلیم احمد اصلاحی — محل نظر
14 آزادی اظہار رائے اور سنیما — عرفات خان — نقطہ نظر
16 آتجھ کو بتاوں تقدیر امم کیا ہے — ڈاکٹر سلیم خان — ادراک
20 حقوق العباد کی اہمیت — ناز آفرین
23 اچھی تقریر اور برا پروگرام — مبشر الدین فاروقی — تربیت
26 طلباء ایکٹوزم کے پس منظر میں۔۔۔۔ — محمد آصف اقبال — جہد
31 صفدر سلطان اصلاحی ہمدم و ہمراز — اشہد رفیق قاسمی
34 جناب صفدر سلطان اصلاحی مرحوم — ڈاکٹر رفعت — خراج
36 کھویا نہ جا صنم کدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ — انس شیخ — دستک
37 تلاش ذات سے منزلِ خود آگہی تک
38 آب حیات (ناول) — مبصر: مبشر الدین فاروقی — کتاب
39 اخبار رفیق — اخبار رفیق

MANAGER
Afsal Rehman 9567797094
managerrmgp@sio-india.org
Asst. MANAGER
Noorul Mubin 08447622919
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation of India, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Abul Aala Sayyed**

ذکر اور معاش

ڈاکٹر وقار انور

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بَعَثَ عتاب بنِ اُسَیْدٍ اِلٰی مَکَّۃَ فقَالَ: اَتَدْرِیْ اِلٰی اَیْنَ اَبْعَثُکَ؟ اِلٰی اَھْلِ اللّٰہِ وَھُمْ اَھْلُ مَکَّۃَ، فَانْھَھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ: عَنْ بَیْعٍ وَ سَلْفٍ وَعَنْ شَرْطَیْنِ فِی بَیْعٍ وَ رِبْحِ مَالَمْ یَضْمَنْ وَ بَیْعِ مَا لَیْسَ عِنْدَکَ۔ (عن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ/ السلسلۃ الصحیحۃ)

’’رسول اللہؐ نے عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کی طرف بھیجا تو فرمایا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھیں کس طرف بھیج رہا ہوں؟ اللہ والوں کی طرف، جو کہ اہلِ مکہ ہیں، انھیں چار چیزوں سے منع کرنا: قرض پر بیع سے، ایک بیع میں دو شرطوں سے، اسی چیز کے منافع سے جو اس کے نقصان کا ضامن نہ ہو، اور ایسی چیز کے فروخت سے جو تمھارے پاس نہ ہو۔‘‘

فتح مکہ کے بعد آں حضرتؐ تقریباً تین ہفتہ مکہ میں قیام کر کے اگلی مہم پر روانہ ہوگئے تھے اور مکہ کی امارت ایک نوجوان عتاب بن اُسیدؓ کے حوالہ کر دی تھی جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اس وقت موصوف کی عمر بائیس یا تیئیس سال کی ہوگی اور وہ صرف چند ہفتہ قبل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس نوجوان نے خود اپنی زندگی کیسی متقیانہ گزاری اور کس احساس ذمہ داری کے ساتھ مکہ کی امارت کا کام بحسن وخوبی انجام دے کر چند ہی برسوں میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ فتح مکہ کے بعد جب حضرت محمدؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا اور انھوں نے اس پر عمل کیا تو یہ حضرت عتابؓ کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا اور اپنے قریب موجود دو افراد سے کہا کہ اچھا ہوا کہ ان کا باپ اسید یہ ذلت آمیز واقعہ دیکھنے سے قبل مر چکا تھا کہ ایک کالا شخص خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گیا۔ آں حضرتؐ ان کے قریب آئے اور بتایا کہ کچھ دیر قبل وہ (عتاب) کیا بول رہے تھے۔ حضرت عتاب کی آنکھ کھل گئی کیونکہ انھیں یقین ہوگیا کہ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان کی گفتگو سے مطلع کر دیا ہے۔ ورنہ کوئی چوتھا شخص وہاں موجود نہیں تھا۔

حضرت عتاب بن اُسید کو مکہ کی امارت سونپتے وقت آں حضرتؐ نے جو نصیحت فرمائی اور جو خاص کام دیا اس کا تذکرہ درج بالا حدیث میں ہے۔ مکہ کے لوگ تاجر پیشہ تھے۔ اس لیے ان کے لیے جو احکامات دیے گئے ان کا تعلق تجارتی لین دین سے ہے۔ اس سلسلہ میں آپؐ نے مکہ والوں (یعنی تاجروں) کو چار چیزوں سے روکنے کا حکم دیا۔ البتہ ان احکامات کے صادر کرنے سے قبل حضرت اُسید کو اس بات کا احساس دلایا کہ انھیں اہلِ مکہ کا امیر بنایا جانا کتنا اہم معاملہ ہے۔ آپؐ نے سوال کیا کہ کیا وہ جانتے ہیں کہ انھیں کہاں مبعوث کیا جا رہا ہے؟ پھر آں حضرتؐ نے خود اس کا جواب دے دیا کہ وہ اللہ والوں کے امیر بنائے جا رہے ہیں جو کہ اہل مکہ ہیں۔ مکہ میں جہاں حضرت عباسؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت سفیان بن حارثؓ اور دیگر اہل اللہ موجود تھے ان کے درمیان ایک نوجوان کو امارت سے سرفراز کرتے ہوئے آپؐ نے ضروری سمجھا کہ انھیں اپنے مامورین کی قدر ومنزلت کا احساس دلا دیں تاکہ راعی اپنی رعیت پر احکام صادر کرنے کے باوجود ان کی حیثیت کا لحاظ کرے اور حدود کا پاسدار ہو۔ جس طرح اس بات کی اہمیت ہے کہ مامورین اپنے امیر کو مخدوم سمجھیں، ویسے ہی اس بات کی بھی اہمیت ہے کہ خود امیر مامورین کا قدردان ہو اور اپنے آپ کو ان کا خادم سمجھے۔ اس حسنِ توازن کے بغیر اسلامی احکامات کی برکات نازل نہیں ہوسکتی ہیں۔

اس حدیث میں حضورؐ نے حضرت عتاب بن اُسید کو مکہ والوں کو چار چیزوں سے روکنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اسلامی شریعت میں معاملات سے متعلق احکامات کا انداز یہی ہے کہ چند مخصوص چیزوں سے روک دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ان چند چیزوں کی ممانعت کافی ہے۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ ہر چیز جائز ہے جب تک اس کے ناجائز ہونے کی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔ حلال کی بنیادی طور پر کوئی فہرست فراہم نہیں کی گئی ہے۔ صرف حرام اشیاء اور کام کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ جو چیز نادرست نہیں ہے وہ درست ہے۔ نادرست صرف گنتی کی چند چیزیں۔ اس کے علاوہ تمام چیزیں جو بے شمار ہیں درست قرار پاتی ہیں۔ آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کے اس حسن نے دین کو یسیر، آسان، قابل فہم اور قابلِ عمل بنا دیا ہے۔ جن چار چیزوں سے مکہ والوں کو منع کرنے کا حکم اس حدیث میں دیا گیا ہے ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر تجارتی اور مالیاتی امور کے بیش تر معاملات کو بہت جامع انداز میں سمو لیا گیا ہے۔ یہ حدیث صرف مکہ کے تاجروں کے لیے نہیں ہے بلکہ جب تک یہ زمین قائم ہے اور اس پر کاروباری لین دین جاری ہے، اسلامی شریعت پر عمل کرنے کے لیے یہ چار باتیں کافی ہیں۔ آپؐ جامع الکلم ہیں اور اس کے مصداق مالیاتی بیع کی اصولی باتیں یہاں بنا دی گئی ہیں اور ان کا لحاظ کر کے اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے امت محمدؐ کے ہر فرد اور ان پر مشتمل اسلامی سوسائٹی کے لیے ان امور میں تفصیلی لائحہ عمل تیار کرنا آسان ہوگیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ احکامات اہل مکہ کو دیے گئے ہیں جو ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہو چکے تھے اور اپنے معاملات اسلام کے مطابق درست کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہو چکے تھے۔

مودی کی جیت کوئی حادثہ نہیں ہے۔

اس جملے کے کئی مطالب ہوسکتے ہیں۔ایک، یہ امر کچھ ڈھکا چھپا نہ تھا کہ مودی جیتے گا۔وہ لوگ جنہوں نے ۲۰۱۴ میں بڑے اطمینان سے مودی کی شکست کی پیشن گوئی کی تھی ان کا تجزیہ تب بھی غلط تھا۔اور اب کی مرتبہ جب بی جے پی کی محدود جیت کا اندازہ کرتے ہوئے، بی جے پی کی کمزور ہوتی ہوئی ساکھ کو پیش کرنے والوں کا تجزیہ بھی غلط تھا۔اس جیت کے بعد بہت سے اہل علم نے تجزیات پیش کئے، جوکہ درست ہوسکتے ہیں۔لیکن بالعموم ملت اسلامیہ اور بالخصوص تحریک اسلامی اس نوشتہ دیوار کو پڑھنے میں ناکام رہے۔دو،مودی کا جیتنا کوئی حادثہ نہیں ہے۔ایسے حالات اہل ایمان کو پیش آتے رہتے ہیں،تاکہ اللہ یہ جان لے کہ ان میں سے اولی العزم کون ہیں۔

اس اعتبار سے ہم جب سید سعادت اللہ حسینی، ڈاکٹر محمد رفعت، ڈاکٹر سلیم خان،عبداللہ جاوید صاحبان کے تجزیات پڑھیں تو اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ لائحہ عمل چاہے کتنا ہی واضح کیوں نہ ہو،تبدیلی کو لانے کے لئے تبدیلیوں کی پیش بینی کا حقیقت پسندانہ ادارک کرنا ایک لازمی امر ہے۔اور اس کام کے لئے عوام سے وابستگی اور نصب العین کے استحضار کے،عملاً مخالف اور اصلاً یکجائی کی کیفیات میں توازن رکھنا بھی ضروری ہے۔ایسا نہ ہو کہ 'قلیل مدتی' کاموں کی تسکین ہمیں 'طویل مدتی' کاموں کے کرنے کے لائق ہی نہ چھوڑے۔اور 'طویل مدتی' کام ہمیں سست رو اور حالات کی پرکھ سے محروم کردے۔ایسے افراد کار پوری ملت میں کہیں نہیں ملتے ہیں جو کہ اس توازن کو باقی رکھیں اور مسلمانوں کی قیادت کا کام انجام دیں۔

کیمپس میں جو محبت مودی اور بی جے پی کے حصے میں آرہی ہے،اس کا کچھ اور ہی عالم ہے۔مغلظات،اتہامات،غنڈی گردی،تعصب اور اقتدار کا نشہ سب کچھ موجود ہے۔اس کا جواب دو طریقوں سے دیا جارہا ہے۔ایک تو لال فسطائی طریقہ ہے۔جس میں صرف شور شرابہ اور میڈیا کا نورِ نظر بننے کی تمام صفات موجود ہیں اور دوسری طرف غیر جانبدار ڈرے سہمے بے چارے طلباء و اساتذہ ہیں۔ایسے میں درست بات کرنے کا اور اسے قابل قبول بنانے کا طریقہ سیکھنا مسلم طلباء کے لئے بہت ضروری ہوگیا ہے۔ایک نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ نئے نعرے، نئے طریقے، نئی باتیں۔تاکہ معذور ذہنیت کے ساتھ زعفرانی فسطائیت کا مقابل کرتے کرتے،طلباء لال فسطائیت کا آلہ کار نہ بن جائیں۔اس طرح کہ 'لال سلام، لال سلام' کے گھٹیا نعرے کے زیر اثر 'لاکھ سلام، لاکھ سلام' کے گھٹیا تر نعرے کا استعمال نہ کرنے لگیں۔ٹکراؤ کا مزاج اور لب ولہجہ کے بجائے،اعتماد اور دلیری کے ساتھ افہام وتفہیم کی صلاحیت اور داعیہ پیدا کریں۔اس علم الکلام کے ذریعے، سیاسی افق اور دعوت دین کا ایک ساتھ کام کیا جاسکتا ہے۔انتخابی سیاست سے دور رہتے ہوئے، سمجھداری کے ساتھ سیاست پر اثر انداز ہونے کے راستے نکالے جاسکتے ہیں۔اس طرح بات کی جاسکتی ہے کہ دین، سیاسی منظر نامے پر موضوع بحث بن جائے۔لیکن اقتدار کی سطحی تعریفات کے کے پیش نظر ہمارے طلباء و قائدین قوت کے حصول کے طریقوں سے دور ہوتے جارہے ہیں۔اور یہیں سے دیگر تنظیمیں اور ادارے قوت حاصل کرکے اقتدار تک پہنچ رہے ہیں۔

یہ بات بہر حال سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام کا اقتدار میں آنا،مسلمانوں کے مسائل کا دور ہونا، دین کی دعوت کا گھر گھر تک پہنچنا، یہ بڑے دؤر کے خواب ہیں۔اور ان کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔جب تک علمی اور عملی حیثیت میں مسلمان صحیح معنوں میں اسلام کی پیروی کرنے والے اور اس کی اشاعت کرنے والے نہ بنیں،کوئی سیاسی پارٹی، جدوجہد،نعرہ،مظاہرہ ان خوابوں کو حقیقت میں نہیں بدل سکتا۔اس لئے تحریک اسلامی کی درست بنیادوں پر تنظیم نو کرنا وقت کا تقاضاء ہے۔اس کے مزاج میں موجود معذرت خواہانہ رویہ، جلد بازی اور بے عملی کا اکھاڑ پھینکنا پڑے گا۔اس تنظیم نو میں افرادی قوت کا اضافہ،علمیت کا فروغ اور ٹھیٹھ دعوت دین سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔اسی طرح مروجہ تنظیمی کلچر، باہمی منافرتیں،تحفظات اور قفس کے آرام کو سختی سے کچلنا بھی اتنا ہی اہمیت رکھتا ہے۔ہندوستان کے تمام مسلم باشندے اس سلسلے میں ٹھوس پیش رفت کے منتظر ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ تحریک اسلامی کی کارکردگی آئندہ کچھ سالوں میں کیا رہتی ہے؟

● مستجاب خاطر

وطن دوستی اور وطن دشمنی

طلبائی سیاست کے تناظر میں

احسن فیروز آبادی

فروری کو دہلی کے رامجس کالج میں اے بی وی پی (ABVP) اور AISA کے درمیان ہوئی نوک جھونک اور لڑائی کا واقعہ وطن عزیز کی سیاست میں مزید گرماہٹ کا سبب بنتا جارہا ہے۔ رامجس کالج میں ہوئے اس شرمناک اور انسانیت سوز واقعے کے بعد اے بی وی پی کے خلاف دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دیگر چند تعلیمی اداروں کے طلباء بڑی تعداد میں سوشل میڈیا کے ذریعہ اپنا احتجاج تادم تحریر درج کرا رہے ہیں۔ اے بی وی پی کے کارکنان کے ذریعہ 21 اور 22 رفروری کو انجام دیے گئے اس پرتشدد واقعہ کے خلاف دہلی یونیورسٹی میں ردعمل ہوا۔ کارگل کی لڑائی میں مہلوک کی بیٹی گرمہر نے جو ٹوئٹ کیا، اس پر نازیبا تبصرے کئے گئے پھر ان تبصروں پر ہونے والی بحثیں اور مذاکرات نے آگ میں گھی ڈالنے کا کام کیا۔ اس تنازعہ کو لے کر متعدد سماجی و ملی تنظیموں کے علاوہ، سیاسی، نیم سیاسی جماعتوں، ریاستی، مرکزی حکومت کے ذمہ داران آمنے سامنے آچکے ہیں۔ طلبہ کے درمیان اس طرح کی واردات نے ایک بار پھر 9 رفروری 2016 کو جے این یو میں ہوئے واقعہ کو دہراتے ہوئے وطن دوستی اور وطن سے غداری کے درمیان طلبہ برادری کو کھڑا کر دیا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال 9 رفروری کو ہوئے واقعہ اور رواں سال 21 اور 22 رفروری کو رامجس کالج کے طلبہ، جے این یو کی سابقہ یونین صدر شہلا راشد کے ساتھ اے بی وی پی کے کارکنان کے ذریعہ کی گئی مار پیٹ دونوں واقعات ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ جے این یو واقعہ کے بعد بھی میڈیا کے ذریعہ وطن دوستی و وطن دشمنی کی بحث چھیڑی گئی تھی اور یہاں بھی اے بی وی پی کے خلاف آواز بلند کرنے کو وطن غداری سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

جے این یو اور رامجس کالج میں ہوئے واقعات پر غور کریں تو ان دونوں ہی واقعات سے جڑا ہوا ایک نام عمر خالد (پی ایچ ڈی اسکالر جے این یو) ہے۔ جے این یو میں ہوئے واقعہ کی طرح رامجس کالج میں 21رفروری کو ہوئے ہنگامے اور شہلا راشد کے ساتھ ہوئی مار پیٹ کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ کے طور پر عمر خالد کا نام پیش کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی افق پر وطن محبت اور وطن غداری جیسے حساس موضوعات دوبارہ موضوع سخن بنائے جا رہے ہیں۔

اس موضوع سخن کا پس منظر

وطن دوستی اور وطن غداری پر گفتگو سے پہلے ہمیں اس پورے منظر نامے کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ یونیورسٹیوں میں ہونے والی ان وارداتوں کے پس پردہ کچھ سیاسی مفادات تو کار فرما نہیں ہیں؟

سب سے پہلے رامجس کالج میں ہوئے واقعہ کی تفصیل جان لیتے ہیں۔ دراصل تنازعہ کی وجہ کالج میں ایک سمینار بعنوان A Culture of Protest a Seminar Exploring Repersentation of Dissent" رکھا گیا تھا۔ اس سمینار میں معروف مقررین کے علاوہ جے این یو کی سابق لیڈر شہلا راشد اور عمر خالد بھی حصہ لینے والے تھے۔ عمر خالد کو وستر (جھارکھنڈ) کے حالات پر اپنے تاثرات بیان کرنے تھے جو کہ ان کی ریسرچ کا موضوع بھی ہے۔ سمینار اپنے ٹھیک وقت پر یعنی 9:30 بجے شروع ہوا۔ اگلے سیشن کے شروع ہونے سے پہلے تقریباً گیارہ بجے Tea Break دیا گیا۔ اسی دوران اے بی وی پی کے کارکنان جمع ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے عمر خالد کے خلاف نعرے بلند کرنے شروع کردیے۔ سمینار منعقد کرنے والے طلبا اور اساتذہ نے اس سلسلے میں کالج کے پرنسپل سے ملاقات کی۔ لیکن پرنسپل صاحب نے کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ ادھر مخالف نعرے بازیوں کا زور دیکھتے ہوئے منتظمین نے عمر خالد کو سمینار میں آنے سے روک دیا یا دوسرے الفاظ میں معذرت کر لی۔ لیکن اس کے باوجود دوسرے سیشن کے آغاز ہونے کے کچھ ہی دیر بعد کارکنان اے بی وی پی نے سمینار ہال پر سنگ باری شروع کر دی۔ نتیجتاً پروگرام کی کارروائی روک دی گئی۔

پولیس کا رول

یہ سب ہوا اور وہاں موجود پولیس خاموش تماشائی بنی رہی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پرنسپل نے سمینار کے منتظمین کی معاونت سے انکار کر دیا تو پھر احاطہ میں پولیس کیوں موجود تھی بلکہ اسے وہاں آنے کی دعوت کس نے دی کیونکہ اطلاع کے مطابق پولیس وہاں سنگ باری سے قبل ہی موجود تھی۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ پولیس نے اس مذموم حرکت کی خاموش تائید کی۔ اگلے دن 22رفروری کو شہلا راشد کی قیادت میں جے این یو، دہلی یونیورسٹی اور AISA کے طلبا نے موریس نگر تھانہ علاقہ میں ایک ریلی نکالی جس میں کئی اساتذہ بھی شامل تھے۔ رامجس کالج میں ہوئی واردات کی رپورٹ تو خیر کیا درج ہوتی۔ ہوا یہ کہ اس ریلی پر اے بی وی پی کے کارکنان نے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں شہلا راشد سمیت کئی طلبہ و اساتذہ کو شدید چوٹیں آئیں۔ قابل افسوس اور حد درجہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں بھی شہریوں کی محافظ پولیس کا کردار یکطرفہ تماشائی کے طور پر سامنے آیا۔ خبروں کے مطابق جو ویڈیوز سامنے آئے ہیں۔ اس حملے میں چند پولیس کے سپاہی بھی شامل تھے۔ اس دردناک واقعہ کا شکار کچھ صحافیوں کو بھی ہونا پڑا۔ اس حملے کے خلاف کئی طلبہ نمائندوں اور اساتذہ نے پولیس ہیڈ کوارٹر کا گھیراؤ کیا اور اپنا احتجاج درج کرایا۔ دوسری جانب

> مرکز میں بی جے پی کی سرکار آتے ہی کچھ یونیورسٹیوں کو ایک سوچی سمجھی سیاست کے تحت نشانہ بنایا گیا اور سبھی کے لیے الگ الگ خاکہ تیار کیا گیا۔ پہلے علی گڑھ یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار پر حملہ کیا گیا اور ان اداروں کو ملنے والے بجٹ میں کمی کی گئی۔ اس کے بعد اس سازش کا خطرناک روپ سامنے آیا۔ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، رامجس کالج دہلی (دہلی یونیورسٹی) میں ہونے والے واقعات اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان واقعات میں ایک اہم سانحہ این آئی ٹی سری نگر (کشمیر) کا بھی ہے جسے ملکی میڈیا نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

اے بی وی پی کے کارکنان نے بھی ایک مارچ نکالا جس میں وندے ماترم، بھارت ماتا کی جے اور ''ڈی یو میں اگر رہنا ہے تو وندے ماترم کہنا ہوگا'' جیسے مشتعل نعرے سنائی دیے۔ اس مارچ کو پولیس کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔
اس پورے سلسلہ واقعات کی خبریں سوشل میڈیا کے ذریعہ آناً فاناً ملک کے کونے کونے تک پھیل گئیں۔ دہلی یونیورسٹی کی ایک طالبہ گرمہر کور کی ٹوئٹ اور اس پر اسے دی گئی دھمکی نے ایک ایسی بحث کا آغاز کردیا کہ جس میں سیاستداں، ایکٹر، سماجی کارکنان سے لے کر کرکٹر بھی شامل ہوگئے۔ گرمہر نے یہ احساس ظاہر کیا کہ وہ اے بی وی پی سے نہیں ڈرتی۔ گرمہر کو سوشل میڈیا کے ذریعہ جہاں حمایت ملی وہیں اسے مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن نوعمر طالبہ (گرمہر) شاید یہ معلوم نہ تھا کہ مخالفت کی آواز کو ناپسند کرنے والے عناصر اسے سیاسی اکھاڑے میں گھسیٹ لیں گے۔ جہاں اسے ایسی ذہنی اذیتوں سے گزرنا پڑے گا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اس بیس سالہ لڑکی کو اتنی ذہنی اذیتیں دیں کہ اسے دارالحکومت دہلی کو ہی خیر باد کہنا پڑا۔ گرمہر کے طرفداروں میں اس کے دادا اور والدہ بھی سامنے آگئے۔ گرمہر کے دادا نے واضح الفاظ میں کہا کہ ''انہوں نے کارگل کی لڑائی میں اپنا بیٹا کھویا ہے اور ان کی پوتی کی آواز کو دبانے والے زیادہ سے زیادہ اسے جان سے مار سکتے ہیں۔ وہیں گرمہر کور کی ماں نے کہا کہ ''ان کی بیٹی وطن پرست ہے اور وندے ماترم بھی کہتی ہے۔ ہمارے وطن کے لوگ صرف جملے سنتے ہیں ان کا پس منظر بھی سمجھنا چاہیے۔''
دوسری جانب عام آدمی پارٹی کی سابق لیڈر اور دہلی بی جے پی کی لیڈر شازیہ علمی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی پر فرد کی آزادی اظہار رائے پر قدغن لگانے کا الزام لگایا۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ 28رفروری کو جامعہ میں ہونے والے مسلم خواتین کے مسائل پر ایک سمینار میں ان کا نام شامل تھا جسے رامجس کالج کے دھرنے کے بعد ہٹا دیا گیا لیکن واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سمینار منتظمین نے بتایا کہ شازیہ علمی کا نام سرے سے شامل ہی نہیں تھا نہ ہی پروگرام کاپی میں ان کا نام لکھا گیا تھا۔
AISA اور دیگر طلبہ کے ذریعہ ایک مارچ کا انعقاد کیا گیا جس میں طلبہ یونین کے سابق صدر کنہیا کمار اور عمر خالد، جے این یو سے ایک عرصہ سے لاپتہ نجیب احمد کی والدہ فاطمہ نفیس اور چند سماجی کارکنان شامل تھے۔ اس مارچ میں آزادی اظہار رائے کو لے کر اظہار خیال کیا گیا اور انصاف اور آزادی کے حصول سے متعلق نعرے لگائے گئے۔ ہمیشہ کی طرح ایک دو ٹی وی چینلوں کو چھوڑ کر سبھی نے سرکار کے وفادار ہونے کا فرض بخوبی نبھایا۔ رامجس واقعہ سے لے کر مارچ تک زی ٹی وی نے اپنی محدود منفی سوچ کا ثبوت دیا۔ ایک پروگرام میں زی ٹی وی اینکر نے کہا کہ ''آزادی اظہار رائے کے نام پر پچھلے سال جے این یو کی طرح پھر سے دہلی میں غیر محدود ڈراما چل رہا ہے کیونکہ بہت سارے لوگوں کو لامحدود آزادی چاہیے جس میں ایک طرف ملک مخالف سوچ رکھنے والے لوگ ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کے بہی خواہ ہیں۔'' ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ان آزادی کے نعرے لگانے والوں کی طرف تھا جو ملک میں وہ تبدیلی نہیں چاہتے جس کا کھوکھلا نعرہ بی جے پی کی طرف سے ان دنوں لگایا جا رہا ہے بلکہ وہ توحق وانصاف پر مبنی وہ تبدیلی چاہتے ہیں جو ہر شہری کو اس کے جائز حقوق کے ساتھ زندہ رکھ سکے تاکہ اسے یہ محسوس ہو کہ وہ ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہے۔ دیش کے حق میں بات کرنے والے لوگوں کا اشارہ (زی ٹی وی کے مطابق) ان لوگوں کی طرف تھا جو بی جے پی، آر ایس ایس اور اے بی وی پی سے تعلق رکھتے ہیں۔

طلبا کی سیاست یا سیاسی سازش

9رفروری 2016 سے لے کر 21 اور 22 فروری 2017 تک جے این یو، دہلی یونیورسٹی میں ہونے والے ان واقعات کو کچھ لوگ طلبا کی سیاست سے جوڑ رہے ہیں۔ لیکن اگر ان سبھی واقعات پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ بہت سے ایسے پہلو بھی ہیں جو ابھی غور طلب ہیں۔ دراصل یہ ایک سیاسی سازش ہے جسے بی جے پی نے مرکز میں آتے ہی عملہ جامہ پہنانا شروع کردیا اور اسے انجام تک پہنچانے کے لیے میڈیا اور یونیورسٹی انتظامیہ نے بھرپور ساتھ دیا۔
مرکز میں بی جے پی کی سرکار آتے ہی کچھ یونیورسٹیوں کو ایک سوچی سمجھی سیاست کے تحت نشانہ بنایا گیا اور سبھی کے لیے الگ الگ خاکہ تیار کیا گیا۔ پہلے علی گڑھ یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار پر حملہ کیا گیا اور ان اداروں کو ملنے والے بجٹ میں کمی کی گئی۔ اس کے بعد اس سازش کا خطرناک روپ سامنے آیا۔ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، رامجس کالج دہلی (دہلی یونیورسٹی) میں ہونے والے واقعات اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان واقعات میں ایک اہم سانحہ این آئی ٹی سری نگر (کشمیر) کا بھی ہے جسے ملکی میڈیا نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔
راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) جس کا مقصد اور نصب العین پورے بھارت کو ہندو راشٹر میں تبدیل کرنا ہے جسے بروئے کار لانے کے لیے یہ تنظیم کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ دستور ہند کے حوالے سے ملک کی عوام کے سامنے آیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے حکومت سازی کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس لیے بی جے پی جو دراصل آر ایس ایس کی سیاسی پارٹی ہے کے مرکز میں آتے ہی اس نے چند قابل ذکر اور معروف تعلیمی اداروں کو اپنا نشانہ بنایا تاکہ وہاں اپنے مخصوص نظریات کو فروغ دے سکے کیونکہ تعلیمی اداروں سے اٹھنے والی آواز کو اگر وہیں پر دبایا نہیں گیا تو پھر یہ آواز حکومت کی غلط کاریوں اور پالیسیوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لیے مرکز

میں حکومت قائم ہونے کے چند ماہ بعد یعنی 30 /اکتوبر 2014 کو دہلی کے مدھیہ پریش بھون میں فروغ انسانی وسائل کی وزیر محترمہ اسمرتی ایرانی کے ذریعہ ایک نشست طلب کی گئی۔جس میں تعلیم سے متعلق لوگوں نے حصہ لیا۔اس میٹنگ میں اکثر لوگ ایسے بھی تھے جن کا براہ راست تعلق آر ایس ایس سے تھا۔اس میٹنگ میں دس یونیورسٹیوں کو نشانہ بنایا گیا اور ان میں کلیدی مناصب پر بھگوا فکر کے ترجمان افراد کو چارج سونپ دیا گیا۔اے بی وی پی جو کہ آر ایس ایس کی معروف طلبہ تنظیم ہے اسے کیمپس میں تخریبی سرگرمیاں انجام دینے کی کھلی چھوٹ دی گئی اور ملک کے خاص خاص تعلیمی اداروں میں فرقہ واریت کا زہر گھول دیا گیا۔

مثلاً حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کے پانچ دلت طلبہ کو ’’مظفر نگر باقی ہے‘‘ فلم کی مخالفت کرنے والے اے بی وی پی کے طلبہ کے خلاف نکالے گئے جلوس کی وجہ سے اتنی جسمانی اذیتیں دی گئیں کہ 26 برس کے پی ایچ ڈی اسکالر روہت ویمولا کو خودکشی کے لیے مجبور ہونا پڑا۔اسے ہاسٹل، دفتر، لائبریری وغیرہ سے استفادہ کے حق سے محروم کر دیا گیا اور یہ سب کچھ یونیورسٹی وائس چانسلر اپاراؤ اور وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے اشارے سے ہوا۔پانچ طلبہ پر وطن غدار کا لیبل لگا دیا گیا۔اسی طرح بی ایچ یو کے پروفیسر پانڈے کو کوکا کولا کمپنی کی مخالفت کرنے اور ایک طالب علم کی قانونی مدد کرنے کے جرم میں انہیں نکسلی قرار دیا گیا اور یونیورسٹی سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔یہاں بھی یونیورسٹی کے اہم مناصب پر آر ایس ایس سے جڑے ہوئے افراد فائز ہیں۔جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سنگھی وائس چانسلر کے آنے کے ٹھیک دس دن بعد وطن پرست اور وطن مخالف کا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا۔جس میں کنہیا کمار، عمر خالد اور چند دیگر طلباء پر وطن غدار ہونے کا معاملہ درج کیا گیا جس کی چارج شیٹ آج تک دہلی پولیس نہیں دے سکی ہے۔ٹھیک اسی طرح کا ڈرامہ 21 فروری سے آج تک جاری ہے۔بی جے پی سرکار ابھی تک 14 تعلیمی اداروں میں سیدھی دخل اندازی کر چکی ہے۔

چند سوالات جو غور طلب ہیں

تعلیمی اداروں میں ہونے والے یہ سانحات چند سوالات سامنے لاتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

1- یونیورسٹی کیمپس میں ہونے والے ان واقعات کے تناظر میں ہر بار اے بی وی پی کا نام کیوں سامنے آتا ہے؟

2- جہاں بھی وطن غداری جیسے حساس موضوعات زیر بحث آتے ہیں وہاں اس مسئلے کی شروعات اے بی وی پی کے ذریعہ ہی کیوں کی گئی ہے؟ اے بی وی پی کو یہ ذمہ داری کس نے دی ہے کہ وہ طلبہ کو وطن دوست یا وطن کے غدار کے سرٹیفکیٹ تقسیم کرے؟

3- اے بی وی پی کے پاس دستور ہند کی رو سے ایسا کون سا معیار ہے جس کے ذریعہ کسی کو وطن کا غدار یا وطن دوست کہا جا سکے؟ اے بی وی پی ایک طلبہ تنظیم ہے اس لیے اسے ان معاملات پر ہی گفتگو کرنی چاہیے جو تعلیم سے متعلق ہوں یا اسے طلبہ برادری کے مسائل کو حل کرنے کے اقدامات کرنے چاہئیں۔اس کے بعد اگر وہ وطن کے عام مسائل پر آواز بلند کرے تو کوئی حرج نہیں۔لیکن دیکھا گیا ہے کہ اے بی وی پی نے نہ تو تعلیمی بجٹ میں ہونے والی کمی پر کوئی آواز اٹھائی ہے، نہ ہی تعلیم کے زعفرانی کرن، تعلیمی پالیسی اور مہنگی فیس جیسے مسائل پر کوئی رائے رکھی ہے بلکہ تعلیمی اداروں میں اے بی وی پی کی سرگرمیاں طلبہ تنظیم کی طرح نہ ہو کر محض ایک خاص مذہبی گروہ کی طرح ہیں۔سرسوتی پوجا سے لے کر بھارت ماتا کی جے اور ’’ڈی یو میں رہنا ہے تو وندے ماترم کہنا ہوگا‘‘ جیسے اشتعال پر مبنی نعرے بازیوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ فضا ہموار کرنے میں اے بی وی پی کا کردار خاصا اہم رہا ہے۔اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اے بی وی پی بھی آر ایس ایس کے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے تعلیمی اداروں میں سرگرم عمل ہے جیسا کہ سوربھ کمار (لیڈر اے بی وی پی) نے لکھا ہے کہ ہندوستان کب کا ہندو راشٹر بن گیا ہوتا اگر جے این یو جیسے ادارے نہ ہوتے۔

5- کہیں ایسا تو نہیں کہ بی جے پی سرکار کی سرپرستی میں وطن دوستی اور وطن غداری کے معاملوں کو جان بوجھ کر ہوا دی جا رہی ہوتا کہ یونیورسٹیوں میں ہونے والے سنگین جرائم پر پردہ ڈالا جا سکے۔جیسا کہ روہت ویمولا کی خودکشی اور جے این یو سے لاپتہ نجیب احمد کے معاملے سے دھیان ہٹانے کے لیے کیا گیا۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ پچھلے برس اے بی وی پی کارکنان نے نجیب احمد کے ساتھ جو کہ جے این یو طالب علم ہے کے ساتھ بری طرح مارپیٹ کی تھی جس کے نتیجے میں اسے شدید چوٹیں بھی آئی تھیں۔اس کے اگلے ہی دن نجیب احمد لاپتہ ہو گیا۔نجیب احمد کی گمشدگی کو لے کر جہاں دہلی ہائی کورٹ نے بھی دہلی پولیس سے سوالات کیے ہیں۔وہیں دوسری جانب ملک کے طول وارض میں دو سو سے زائد احتجاجی ریلیاں نکالی جا چکی ہیں۔کئی دینی وسماجی تنظیموں نے نجیب احمد کی پراسرار گمشدگی کو لے کر سوالیہ نشانات لگائے ہیں۔جے این یو کی سابق یونین لیڈر شہلا راشد کے اے بی وی پی پر نجیب احمد کی گمشدگی کا الزام لگایا ہے۔جے این یو کے طلبا اس کیس کو ٹھنڈے بستے میں نہیں ڈالنے دینا چاہتے ہیں۔دوسری جانب سرکار اس سانحہ کے بعد مکمل خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ان حالات میں سرکار کے ذریعہ بلکہ اس کی ناک کے نیچے اے بی وی پی کارکنان کو یونیورسٹی احاطے میں غنڈہ گردی کی کھلی چھوٹ دینا اور نجیب احمد اور روہت ویمولا کے معاملے میں خاموش رہنا کہیں اس کے ایجنڈے کا حصہ تو نہیں ہے؟

ناموسِ عورت اور فسطائی طرزِ عمل

جویریہ ارم

اسلام نے سوال اٹھانے ، اس کا اطمینان بخش جواب حاصل کرنے ،تعمیری تنقید کرنے کو اسلامی علمِ سیاسیات کا حصہ بنایا۔ نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین نے اس کو رواج دیا۔ مجموعی طور پر حق جانکاری کو مسلمانوں نے ہی حوصلہ افزائی دی جو نیک نیتی اور شفافیت کو برقرار رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔ ایک ترقی پسند سماج اور مملکت کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو تحقیق کرنے، تجزیہ کرنے، اپنے مشاہدات کا افشاء کرنے، سماج کا تنقیدی جائزہ لینے اور سوال کرنے کی آزادی ہو۔

آج ملک میں ایک عجیب فضاء بنی ہوئی ہے، سربراہان مملکت اور ان کی حواری جماعتیں سوال کرنے پر چراغ پا ہوجاتی ہے۔ آپ سوال کریں، جواب کے بجائے ایک الٹا سوال آپ سے ہی کردیا جاتا ہے۔ آپ نوٹ بندی کی بات کریں اور آپ سے سیاچن کے سپاہیوں کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔ سیاچن میں سخت ترین حالات میں ڈیوٹی دینے والے سپاہی خود سوال کرنے کی آزادی مانگ رہے ہیں۔ نہ عام شہری کو، نا سپاہی کو، سنتری سے لے کر اپوزیشن کے منتری تک کو سوال اٹھانے اور نہ ہی اظہار خیال کا کھلا موقع ہے۔ سب سوال کرنے والے لوگوں سے بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، طبقہ وپیشہ، انتظامیہ اور ان کے فسطائی خداؤں نے خفا ہوجانا ہے۔

فسطائیت اپنے عروج پر ہے، ہر حربہ استعمال کر کے مخالفین کچل دیا جاتا ہے تو اپنے حواریوں کی پشت پناہی زبردست انداز میں ہوتی ہے۔ فسطائیت مخالف سماجی کارکنوں، اساتذہ، طلباء طالبات کو قانونی داؤ پیچ میں پھانسا جاتا ہے دوسری طرف اپنے حلیفوں کو فوجداری مقدمات سے بڑی صفائی سے بچالیا جاتا ہے۔ غنڈہ گردی، مار پیٹ، قتل وغارت گری اور قانونی داؤ پیچ کھیل کھیل کر ہراساں کیا جارہا ہے۔ ان کی تازہ مثالیں انھاد کی بیرونی فنڈینگ پر پابندی، تیستا ستلواڈ کا مختلف کیسس میں عدالتوں کے چکر کاٹنا، گئورشا کے نام پر انسانی خوں کا بہانا سے لے کر رام جاس کالج میں شہلا راشد اور کامریڈس کی پٹائی، اسیمانند کا بری ہوجانا یا پھر سماجی رابطہ کی سائٹس پر Trolling سب سے آسان حربہ ہے ہی، سماجی رابطہ کی سائٹس پر حکومت مخالف یا دائیں بازو مخالف Tweets اور Post پر چند گھنٹوں میں جنگ کا گرم ماحول بن جاتا ہے، کئی موقعوں پر معمولی باتیں ٹرینڈنگ میں آجاتی ہیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنی فراغت میسر آتی کیسے ہے لوگوں کو ، یا پھر مخصوص IT Teams تشکیل دیں گئیں ہیں جن کی دال روٹی Troll کرتے رہنے پر ہی چلتی ہے۔ فراغت کے اسباب جاننے کے علاوہ اور بھی غم ہیں زمانے میں، جیسے نظریاتی مخالف مرد کے Troll ہونے اور نظریاتی مخالف عورت کے Troll ہونے کے Pattern مختلف ہیں۔ ایک غدار یا Anti nationalist کہلاتا ہے تو دوسرا غداری کے ساتھ ساتھ فحش بھی کہلاتا ہے۔ JNU کی معروف ٹیچر نیویدیتا منن، DU کی طالبہ گرمہر کور، سماجی کارکن تیستا ستلواڈ، گجرات فائلس کی مصنفہ رعنا ایوب، برکھا دت مشہور جرنلسٹ غرض تمام خواتین جن کا مختلف شعبہ ہائے جات سے تعلق

اور بڑی خدمات ہیں۔ان خواتین میں مشترک وصف ان کے سوچنے سوال کرنے کی ''بُری عادت'' جو مخصوص طبقہ کے حلق سے نیچے اترنہیں پاتی، ردعمل کے طور پران کے اخلاق کردار، شکل صورت، رہن سہن الغرض شخصی حملہ کئے جاتے ہیں۔شہلا راشد حکومت، نریندرمودی اور RSS کی طلباء تنظیم ABVP پر اپنے تبصروں کی وجہ سے جانی جاتی ہیں۔AISA کے رکن شہلا راشید نہ صرف طلباء کے مسائل بلکہ ملکی سیاست کی سمجھ بھی رکھتی ہیں، JNUSU صدر رہ چکے کنہیا کمار کی گرفتاری کے بعد حکومت کے ان کو گرفتار کرنے اور غداری کے الزامات لگانے پر انھوں نے حکومت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور انکی رہائی کے لئے بڑی دلیری سے مہم چلائی۔دائیں بازو اور بائیں بازو جماعتوں کا ٹکراؤ کوئی نئی بات نہیں ہے اقتدار میں آنے کے بعد دائیں بازو کا اپنے سیاسی ونظریاتی حریفوں کو کچل دینے کی کوشش کرنا تشویشناک ہے۔ملکی سیاست میں جو کچھ چل رہا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اسلام اور کمیونزم بھی دومختلف نظریات ہیں، شہیلا راشد کو صرف ان کے کشمیری مسلمان گھرانے سے تعلق کی وجہ سے مسلمانوں کی تائید حاصل نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا تکثیری مزاج ہے، تکثیریت بھی کسی سماج میں ایسے متعدد گروہوں کی موجودگی اوران کے درمیان رواداری جو مختلف رنگ ونسل یا سیاسی تصورات کے ہوں۔ حالیہ ان کے ایک Post پر کافی کہرام مچا جس میں انھوں نے Hate speech اور اہانت کے درمیان فرق کو بتانے کی کوشش کی، کئی مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا، AMU کی طالبہ نے بھی FIR درج کروائی، دائیں بازو نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں میں برداشت نہیں ہے جبکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہلا کی تائید کے باوجود ان کی کسی بھی بات سے اختلاف ہوسکتا ہے، جو چیز بُری لگے گی مسلمان کہے گا کہ بُری لگی، اہانت کو اہانت کہے گا، مودی بھکتوں کی طرح صحیح اور غلط کی تمیز نہیں کھو دیں گے لیکن فرق یہ ہے کہ دائیں بازو فسطائی طاقتوں کی طرح شہلا پر نازیبا فحش تبصرے نہیں کہنے لگے یہی سوچ ہے جو ہمارے اوران کے درمیان مشترک ہے جس میں ہم ساتھ ہیں یہ مسلمانوں کا ردعمل تھا اس کے علاوہ JNU کی معروف ٹیچر نویدیتا مَنن سے بھی اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس بات میں دورائے نہیں کہ وہ ایک قابل استاد ہیں ان کی لکھیں کتابیں نصاب میں شامل کی جاتی ہیں خواتین کے حقوق کے لئے ان کی گراں قدر خدمات ہیں، غنڈہ گردی کر کے یا غداری کے مقدمات چلا کر یا تقاریر کے Videos کو متن سے الگ کر کے سماج میں ان کی ساکھ کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، کئی مسلمان قائدین نے کہا کہ محترمہ یہ سوال اٹھا رہی ہیں کہ منوواد اور برہمن واد انسانی حقوق کے خلاف ہیں تو برہمن واد کے حامی افراد کو چاہئے کہ اس کا تسلی بخش جواب دیں انھیں ہراساں کرنا مناسب رویہ نہیں ہے، یہی اپوزیشن اور باقی تنظیموں کا خیال ہے۔2002 اور 2007 کے درمیان نریندر مودی اور امیت شاہ کے گجرات میں فسادات اور فرضی انکاؤنٹرس کا رعنا ایوب نے Under cover جا کر ثبوت حاصل کیا، پولیس، بیوروکریٹس کے اقبالیہ بیانات ریکارڈ کئے اور گجرات فائلس کتاب تصنیف کی، حقائق کو منظر عام پر لانے، سچائی کے لئے جدوجہد کرنے اور اپنی جان جوکھم میں ڈالنا سربراہ مملکت کا طاقت کا کیا گیا غلط استعمال کا افشاء کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک عورت کا ایک دلیرانہ اقدام تھا۔اس سب کے بعد اپنے مزاج کے مطابق فسطائی طاقتوں نے اپنے غصہ اور جھنجلاہٹ کو دور کرنے کے لئے رعنا ایوب کو troll کرنا شروع کیا۔اسکے علاوہ شبنم ہاشمی کی تنظیم (Act Now for A N H A D Harmony and Democracy) جو انھوں نے گجرات فسادات کے بعد 2003 میں کھولی تھی اس کی بیرونی فنڈنگس حکومت نے بند کردیں، انھوں نے فسادات متاثرین گجرات کی باز آبادکاری اور حصولِ انصاف کے لئے کافی جدوجہد کی اوران کے troll کئے جانے کے لئے یہ سبب کافی ہے۔

پچھلے وقتوں میں گلی محلوں کے معمولی جھگڑوں میں جاہلوں کا ایک دوسرے کی ماں بہن کو گالیاں دینا عام تھا۔آزاد ہند نے گزرے 70 سالوں میں مادی ترقی تو کرلی کیا اس کی سوچ نے بھی ترقی کی ہے؟ یہ اہم سوال ہے۔آج سماجی زندگی میں خواتین کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے ان کی شمولیت بھلے ہی بڑھ گئی ہے لیکن دنیا کی یہ بڑی جمہوریت نے عورت کو عزت دینا سیکھا ہے یا نہیں؟ جو طرزعمل کبھی صرف جاہلوں کا ہوا کرتا تھا اس ترقی پسند دور میں کئی پڑھے لکھے جاہل سماجی رابطہ کی سائٹس پر وہی گالیاں فحش جملے، انگریزی میں تحریر کرتے ہیں، پہلے دی جانے والی گندی گالیوں کا ریکارڈ صرف نامہ اعمال میں ہوتا تھا اب سماجی رابطہ کی سائٹس پر بھی باضابطہ محفوظ ہورہا ہے۔دیکھنے والے ہندوستانی سماج کا کیا تصور لیں؟ نئی نسلیں کیا عکس لیں؟ بحیثیت قوم ہم ہندوستانی کس سمت میں جا رہے ہیں؟ ہماری مجموعی حیثیت کیا ہے کیوں کہ ہماری زبان ہمارے ذہن و دل کی عکاس ہوتی ہے۔کوئی Tweet کرتا ہے کہ رعنا ایوب کو سننے سے اچھا ہے کہ کوئی فحش فلم دیکھ لی جائے، جواباً رعنا ایوب لکھتی ہیں ترجیحات کی آزادی۔۔جو خاتون حکومت وقت سے سوال کرنے کی سوچے وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرلے کہ '' troll شاکھ'' حیاباختہ جملوں کے ساتھ جوابی حملہ کرے گی۔برکھا دت کو presstitute کہہ کر troll کیا گیا۔حکومت وقت کے نمائندے ارون جیٹلی نے اپنی ہتک عزت پر عدالت میں دس کروڑ کا مقدمہ کردیا۔کیا برکھا کو دس کروڑ نہیں ملنے چاہئیں، رعنا ایوب اور شہلا راشد کو نہیں ملنے چاہئیں؟ یا پھر ان خواتین کی کوئی وقعت نہیں ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ سمرتی ایرانی اپنے غلط فیصلوں کی وجہ سے کافی سرخیوں میں رہی، سوشل میڈیا اور مین اسٹریم میڈیا میں تضحیک کا بھی سامنا کر چکی ہیں مگر ان پر مخالفین نے اس شدید حدت کے فحش تبصرے نہیں کئے جیسے سیاسی حریفوں پر آج کل ہو رہے ہیں۔پرینکا گاندھی کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے حکمراں جماعت کے ایک فرد نے کہا تھا کہ

''ہمارے پاس پرینکا گاندھی سے زیادہ خوبصورت خواتین ہیں جو اترپردیش میں انتخابی مہم چلائیں گیں مجھے لگتا ہے سمرتی ایرانی بھی خوبصورت ہے''۔ جواباً لوگوں نے کہا کہ اس سے ان کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے خوبصورت خواتین کو پارٹی میں رکھا ہوا ہے؟ اس میں دو رائے نہیں کہ اس خطرناک رویہ کی

آج سماجی زندگی میں خواتین کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے ان کی شمولیت بھلے ہی بڑھ گئی ہے لیکن دنیا کی یہ بڑی جمہوریت نے عورت کو عزت دینا سیکھا ہے یا نہیں؟ جو طرز عمل کبھی صرف جاہلوں کا ہوا کرتا تھا اس ترقی پسند دور میں کئی پڑھے لکھے جاہل سماجی رابطہ کی سائٹس پر وہی گالیاں فحش جملے، انگریزی میں تحریر کرتے ہیں، پہلے دی جانے والی گندی گالیوں کا ریکارڈ صرف نامہ اعمال میں ہوتا تھا اب سماجی رابطہ کی سائٹس پر بھی باضابطہ محفوظ ہو رہا ہے۔ دیکھنے والے ہندوستانی سماج کا کیا تصور لیں؟ نئی نسلیں کیا عکس لیں؟ بحیثیت قوم ہم ہندوستانی کس سمت میں جا رہے ہیں؟

مخالفت نہیں کی جا رہی ہے، بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے مگر یہ ناکافی ہے سوئے ہوئے ضمیروں کو جگانے کے لئے troll کرنے والوں کو لعنت ملامت کرنا کافی نہیں عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔

اسلام ہمیں ایسے ماحول میں کیا کرنے کو کہتا ہے اس کا جائزہ لینا ہوگا، اہانت کے بارے میں آیا ہے کہ کبیرہ گناہوں میں کسی شخص کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا ہے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں وہ دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو ردعمل میں وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے، وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ (مسلم)

حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کسی کو اپنے ماں کی ناموس کی حفاظت کرنی ہے تو اسے دوسروں کے ماں کی اہانت، لعن طعن کے شعار کو ترک کرنا ہوگا، خواہ اس کی نظر میں وہ کتنے ہی بے توقیر کیوں نہ ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام نے عورت کو بدنام کرنے والوں کے لئے سزا بھی رکھی ہے اس کو تازیراتی قانون بھی بنا دیا۔ جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی (۸۰) درے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہے۔

عورت کی عزت اور ناموس کی حفاظت اور اس کی شناخت، اس کے رنگ روپ اور خوبصورتی سے نہ ہو بلکہ اس کی ذہانت اور قابلیت پر ہو یہ اسلام سکھاتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ایسے پروگرامس و سمینار وغیرہ منعقد کریں جہاں مختلف نقطۂ ہائے فکر کے بااثر افراد گفتگو کر سکیں دوسرے مذاہب وازمس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم دینا ہوگا جہاں وہ اپنا نظریہ پیش کر سکیں اور ہم اسلامی معاشرتی آداب، اقدار اور روایات کو پیش کر سکیں تاکہ انہیں واضح ہو سکے کہ حالات حاضرہ میں اسلام ہی واحد نظام حیات ہے جو فلاح کا ضامن ہے۔ ہمیں ایک ایسے سماج کا اور ایسی ریاست کا خواب دنیا کو دکھانا ہوگا جو نبیؐ نے ہمیں دکھایا ہے جہاں سو فیصد عورت محفوظ ہوں، ریاست کے ایک جغرافیائی کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک تنہا عورت محفوظ سونا اچھالتی ہوئی جائے اور کوئی چور اور نہ کوئی منچلا ہو جو اسے نقصان پہنچا سکے۔ مسلمان جب مکہ میں رہے اور جب وہ حبشہ ہجرت کر گئے، دونوں جگہ انھوں نے تکثریت کا ثبوت دیا اپنے عقیدے اور مذہب پر چلتے ہوئے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مل کر رہے۔ حبشہ کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی ان کے وفادار رہے اسی طرح جب مدینہ پہنچے تو یہودی، عیسائی اور مشرکین پر مکمل سماج میں امن معاہدات کئے اور ایک دوسرے کی مدد اور تعاون و حفاظت کا عہد کیا اور پابند عہد رہے۔ مذہبی رواداری، انسانی مساوات ہی اسلام کا درس ہے جس کی کمی آج ملکی سیاست میں نظر آ رہی ہے۔ ان موضوعات اور اپنی روایات کا سماج کے سامنے لانا اور اسے ایک مثالی سماج بنانا ہمارا فریضہ ہے۔

لال فسطائیت

(یہ ایس آئی او۔ جے این یو، YFDA,BAPSA اور MSF کا مشترکہ بیان ہے۔)

"تمام لوگ میری طرفداری اور مدد کرنے سے پیچھے ہٹ رہے ہیں کیونکہ میں ایک باحجاب مسلم طالبہ ہوں اور ایس ایف آئی (اسٹوڈنٹس فیڈریشن آف انڈیا) سے سینہ سپر ہوں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ کیمپس چھوڑ دیں جبکہ ہم یہاں رہنا اور تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اس رویہ کے بالمقابل آپ کی یہ خاموشی خطرناک ہے اور ان کے اس سفاکانہ اور غیر جمہوری طریقوں سے حمایت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ لمحے مجھے ایم ٹی انصاری کے وہ الفاظ یاد دلاتے ہیں'' کاش کہ وہ انسان ہوتے مگر افسوس وہ مسلمان تھے۔''"

مندرجہ بالا الفاظ ہیں سلویٰ عبدلقادر کے جو گورنمنٹ کالج، مڈپلی کی طالبہ اور انقلاب اسٹوڈنٹس موومنٹ کی ایک کارکن ہیں۔ جنہیں نازیبا الفاظ اور حرکات کا نشانہ بنایا گیا اور ساتھ ہی فون اور سوشل میڈیا پر قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں اور اب تک وہ کسی بھی طرح کی کاروائی کی جکڑ سے آزاد ہیں۔ یہ واقعہ نہ صرف ایس ایف آئی کے فسطائی چہرے کا آئینہ ہے بلکہ سرکاری اداروں میں مخصوص ذہنیت کے اساتذہ اور طلبا کے آپسی گٹھ جوڑ کا بھی مظہر ہے۔ بائیں محاذ کی جانب جھکاؤ رکھنے والے شعراء پر طنز کرتے ہوئے سلویٰ کہتی ہیں کہ ان پر ہوئے حملے کے خلاف یہ کوئی شعر کیوں نہیں کہتے؟ اسی لئے کہ یہ نام نہاد ترقی پسند شاعروں کا یہ سارا گٹھ جوڑ ایس ایف آئی کے شدید اسلام مخالف ذہنیت رکھنے والوں سے ہے۔ یہ تنظیمیں اسی طرح کے نازیبا حملے کرتی آئی ہیں اور کرتی رہیں گی، اور کسی بھی قسم کی مزاحمت کا سامنا ہونے

پر ایک دوسرے کی حمایت میں اقدام بھی کرتی ہیں۔اس سارے گٹھ جوڑ کے تانے بانے، کیرالا کی اپنی تاریخ میں ہی پوشیدہ ہیں جہاں نچلے طبقات کو نہ صرف تعلیم بلکہ لباس تک پہننے کی آزادی سے محرومی تھی، ان تنظیموں کی اندرونی ہیئت میں اب بھی اسی وہی سفاکانہ اذہان مصروف کار ہیں۔

امبیڈکر اسٹوڈنٹس موومنٹ کے کارکن وویک اور یونیورسٹی کالج کے طالبعلم جگیش پر بھی حملہ کیا گیا اور بعد میں انہیں منشیات کے کاروباری بتا کر ان حملوں کی توجیہ کی کوشش کی گئی۔ایس ایف آئی کی اس غنڈہ گردی کا شکار نہ صرف ان کے نظریاتی مخالفین (بائیں بازو کی نظریات سے غیر متفق) ہیں، بلکہ بسا اوقات تو بائیں محاذ کی دیگر تنظیموں جیسے آل انڈیا اسٹوڈنٹس اسوسیایشن اور آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنان بھی رہے ہیں۔ان حملوں کو محض ایس ایف آئی کی دیگر تنظیموں کے خلاف غنڈہ گردی کے نظریہ سے دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بات انتہائی قابل غور ہے کہ یہ حملے محض مسلم اور دلت طلبا پر ہی ہوئے ہیں، اور یہ بات مڈپلی کالج کی ایس ایف آئی یونٹ کے بیانات سے واضح ہے جو سلویٰ عبدالقادر پر حملے کے تناظر میں دئے گئے۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسلم خواتین کے پردہ کا مذاق اڑایا بلکہ سلویٰ کے حجاب پر شرارتی طنز کسے اور اسے تاریکی اور بیمار ذہنی سے تعبیر کیا۔خود کو صنفی مساوات اور جنسی حقوق کے علمبردار کہنے والے ان کارکنوں کا دوغلہ چہرہ سامنے آیا، جب انہوں نے یونیورسٹی کالج میں جگیش نامی طالب علم اور اس کی ساتھی طالبات اسمتا اور گائتری پر حملے کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ غیر اخلاقی حرکتوں میں ملوث پائے گئے۔جہاں تک مسلم طلبا پر حملہ کا معاملہ ہے یہ پہلا واقعہ نہیں ہے، اس سے قبل بھی نام نہاد ترقی پسندی کا راگ الاپتے ہوئے انہیں لباس کی بنیاد پر پسماندہ سوچ کا حامی کہا جاتا رہا ہے۔

بائیں محاذ کی دیگر تنظیموں کا ردعمل بھی قابل دید ہے جو صرف زبانی جمع خرچ کی حد تک نوحہ کرتے ہیں کہ ایس ایف آئی کا یہ طرز عمل ترقی پسندی تحریک کے لئے شرمندگی کا باعث ہے۔درحقیقت ان حملوں کے پس پشت صرف ایس ایف آئی (مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی طلبا تنظیم) کی تنگ ذہنیت ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کے تئیں پورے کیرالا کے بایاں محاذ کے تمام ہی حلقوں کی ذہنیت کا یہی حال ہے اور بالخصوص ان اضلاع میں جہاں مسلمان کثرت تعداد میں ہیں۔یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں کا اپنے لباس سے اپنے اقدار کا اظہار ان نام نہاد ترقی پسندوں کو ایک نہیں بھاتا، وہیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اپنی ترقی پسندی میں کس طرح یہ لوگ مسلم مخالف جذبات کو معاشرے میں اپنی قوت بیان سے پھیلاتے ہیں۔حالانکہ بائیں بازو کا مرکزی دھارا یہ توجیہ پیش کرتا ہے کہ یہ حرکات تعلیمی اداروں میں مذہب کی مداخلت کے منافی ردعمل ہوتا ہے مگر ان کی یہی دلیل کافور ہو جاتی ہے جب وہ خود مذہبی اکثریتی طبقات کی رسومات کو عوامی پروگرام کی طرز پر منعقد کرتے ہیں۔

یہ بات عیاں ہے کہ منڈل کمیشن سفارشات اور بالخصوص بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلم طلبا و نوجوان اور تنظیمیں عوامی اداروں میں اپنا مقام اور حصہ داری کے لئے زیادہ متحرک ہو گئے ہیں، وہیں دوسری جانب مسلمانوں پر ان حملوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ برہمنی لابی کے لئے یہ بات پریشان کن رہی ہوگی۔مگر اصل نکتہ غور کرنے کا یہ ہے کہ کیرالا کا بایاں محاذ کس قدر برہمنی یا فسطائی ذہنیت رکھتا ہے۔جو دلت یا مسلم طلبا کے موجودگی سے اور ان حلقوں سے اپنے حقوق کے لئے اٹھنے والی مضبوط آوازوں سے پریشان ہے۔

اس ضمن میں یہ بنیادی نکتہ بھی قابل غور ہے کہ کیرالا کے کیمپس میں کس طرح 90 کی دہائی سے بائیں محاذ (بالخصوص ایس ایف آئی) کی اجارہ داری قائم ہے۔سابق دلت و بہوجن کارکنان کے مطابق یہ ان طاقتوں کی دھمکی، تشدد کا استعمال اور سیاسی حقوق سے محروم کرنے جیسی سازشوں کے نتیجے میں ہی ممکن ہوا ہے۔منڈل کمیشن کی سفارشات کے بعد متعدد دلت مسلم تنظیموں نے تعلیمی اداروں میں سرگرمی دکھائی اور جب بھی اپنی آواز بلند کی انہیں ان حملوں سے نوازا گیا اور بنیاد پرستی، شدت پسندی اور فرقہ واریت کا حامی کہا گیا۔سچ تو یہ ہے کہ یہ اس ''سیکولر دہشت'' گردی کی بنیاد پر ہو رہا ہے جس کی بالادستی کا ایس ایف آئی دعویٰ کرتی ہے۔فسطائیت کے اس ماحول میں جب ہم آمرانہ ہندوتوا کی مزاحمت کرتے ہیں تو وہیں ان بائیں جانب کے برہمنی عناصر کی شناخت بھی ضروری ہے جو خود کو ''آزادی، جمہوریت اور سوشلزم'' کا علمبردار کہتے ہیں۔

محلِ نظر

کلیم احمد اصلاحی

ہندوتوا فاشزم اعلیٰ تعلیمی اداروں میں

۲۰۱۴ میں این ڈی اے حکومت کے مرکز میں آنے کے بعد اعلیٰ تعلیمی ادارے ہندوتوا کی گرفت میں آتے جا رہے ہیں۔ جس طرح بہت منظم طریقے سے تعلیمی اداروں کے ماحول کو پراگندہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ حالیہ دنوں میں پیش آنے والے ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں میں ہونے والے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ اعلیٰ تعلیمی عہدوں پر ہندتوا ذہنیت کے حامل افراد کی تقرریاں ہوں یا ان اداروں میں ان سے متعلق کورسوں کی شمولیت کا ہو یا پھر UGC پر کنٹرول کا معاملہ ہو اور اس سے کہیں بڑھ کر RSS اور BJP کی طلباء تنظیم ABVP کی کھلم کھلا غنڈہ گردی جو کہ اس قدر بے قابو ہوتی جا رہی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس غنڈہ گردی کے آگے انتظامیہ لاچار و بے بس ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ بلکہ ان کو چھوٹ دینا ایک منظم سازش کا حصہ ہے، تا کہ وہ طلباء کے اندر منافرت پھیلا سکیں اور ان کے اندر ہندو مسلم یا پھر ہندتوا اور سیکولرزم کی تقسیم اس انداز میں کر دیں کہ کچھ دنوں میں وہ وقت بھی آ جائے جب یہ مفروضہ طلباء کے شعور میں پیوست ہو جائے کہ ہندتوا ہی سب کچھ ہے اور ترقی کا دارومدار ملک کی سالمیت سب اسی سے منسلک ہے۔ چنانچہ جو کچھ گزشتہ دو سالوں میں ABVP کے ذریعہ شر انگیزی، غنڈہ گردی ہوئی ہے وہ سب ہندو فاشزم کی اصل تصویر ہے۔ یہ صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ چاہے وہ JNU ہو یا پھر DU یا اس سے پہلے جو کچھ HU اور الہ آباد یونیورسٹی میں ہوا ہے اور پھر اس پر مرکزی حکومت کا سرد رویہ یہ کس بات کی غمازی کر رہا ہے؟ حد تو یہ ہوگئی ہے کہ نجیب کی گمشدگی پر پچھلے پانچ مہینوں سے پورے ملک میں مظاہرات کا سلسلہ جاری ہے ملک کی سیکولر عوام عدالت سے لے کر حکومتِ وقت کے دروازے پر بھی کئی بار دست دے چکی ہے مگر بے حس حکومت اور انتظامیہ خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ آج تک اس پر خاطر خواہ کارروائی نہیں ہوئی یہاں تک کہ ان ملزمین کو گرفتار تک نہیں کیا گیا، آخر کیوں؟

یہ سب کچھ دراصل مودی حکومت کی سربراہی میں حکومت کے تحت ہندتوا ایجنڈے کو مضبوط کرنے کی منظم سازش ہے ہندو فاشزم کو تھوپنے کا ارادہ کھل کر سامنے آ رہا ہے اور ABVP کو اس کا محرک بنایا جا رہا ہے اور ان پر پولیس کی رعایت اور حفاظت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

اظہارِ رائے کی آزادی سلب ہو رہی ہے:

آزادی اظہار ہی طلبہ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اسی کے ذریعہ وہ دنیا کے میدان میں جنگ کرتا ہے، مگر اب اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے نہ صرف طالب علم بلکہ اب یہ اساتذہ کے لیے بھی شجرِ ممنوعہ ہے، جیسا کہ کچھ دنوں پہلے اسی نوعیت کا ایک واقعہ JNU میں پیش آیا کہ ایک ہسٹری کے لیکچرر نے کشمیر کے مسئلے کو پڑھاتے ہوئے اس پر نہ موجودہ دونوں حکومتوں یعنی ہندو پاک کا نظریہ اور اس پر اپنا موقف رکھا تو نہ صرف ABVP کے غنڈوں نے اس پر ہنگامہ کیا بلکہ لیکچرر کو ملک مخالف وغدار قرار دیا گیا۔

بھائی چارے کا ماحول کا فقدان:

ایک وقت تھا جب طالب علم خاص طور سے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے منسلک کافی ہاؤس اور ڈھابے پر بیٹھ کر بحث کیا کرتے تھے کہ ہمارا آئیڈیل ہندوستان کیسا ہو اور ہر شخص اس پر اپنی رائے رکھتا، دلیل دیتا اور بحث مباحثہ کرتا، اپنے ذہن کی مشق کرتا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر سب آپس میں مل کر ہاسٹل کی راہ ہوتے، وقت گزاری اور تعلیمی مشق کا اس سے بہتر اور بھائی چارے کی اس سے عمدہ اور کیا مثال ہوتی مگر اب یہ ماحول قصہ پارینہ بن گیا اب تو وہ کوئی بھی بات کرنے سے نہ صرف کتراتا ہے بلکہ آپس میں میل ملاپ بھی رکھنا نہیں چاہتا کہ کہیں اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آ جائے یا سامنے والا اس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے، اس ہندتوا وادی ایجنڈے نے ہر ذہن میں خوف پیدا کر دیا ہے کہ کب کس کے ساتھ کیا ہو جائے؟ اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے؟

جمہوریت کا قلع قمع:

ترقی کے نعرے میں وجود میں آئی مودی حکومت نے دراصل اب تک منظم طور پر ادارہ جاتی طریقے سے ہندتوا اور سیکولرزم کے درمیان تقسیم کا کام کیا ہے اور فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ RSS آج بھی ہندو راشٹر کے اپنے مقصد پر قائم ہے اور ہمہ وقت اس کے لیے کوشش کر رہی ہے کہ ملک کو ہندو راشٹر بنا دے۔ چنانچہ اس ضمن میں کئی چیزیں سامنے آ رہی ہیں جیسے ابھی پارلیمنٹ میں ایک بل یہ پیش ہوا کہ ملک کے تمام اسکولوں میں گیتا کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ اسی طرح تاریخ ہندوستان کو پھر سے لکھنے کی کوشش زور شور سے ہو رہی ہے تا کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طلبہ کے دماغ میں ہندتوا کا بیج ڈال دیا جائے اور دیگر نظریات کے متعلق منافرت پیدا کی جائے۔ جس کے تحت HRD منسٹری کی طرف سے BSAN (بھارتی شکشا نیتی آیوگ) کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ماضی میں بھی تاریخ ہندوستان کو مسخ کرنے، مسلم مخالف کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بڑے پیمانے پر نئی تعلیمی پالیسی لائے جانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جس کے پیچھے اصل مقصد یہ ہے کہ تاریخ کی تجدید اپنی ذہنیت کے مطابق کی جائے تا کہ تقسیم ہندوستان کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا جائے اور ہیڈ گوار کو اصل بلکہ سب سے بڑا آزادی کا مجاہد بنا کر پیش کیا جائے۔

چنانچہ ایسی کوششیں RSS کے ہزاروں اسکولوں میں ۴۰ سال سے ہو رہی ہیں اور ان میں ایسے مواد اور نصاب شامل درس ہیں جو کہ مسلم مخالف اور مسلم دشمنی پر مشتمل ہے۔ جن سے ایسے فارغین نکل رہے ہیں جو مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک ہندوستان کو ہندو راشٹر میں تبدیل کرنا ہی مقصدِ زندگی ہے۔ جس کی عملی تعبیر کو شرمندہ خواب کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جایا جا سکتا ہے۔

آزادی اظہار رائے اور سنیما

جرأتِ اختلاف کا جائزہ

عرفات خان

امریکی انتخابات یوں ما نیے انتخابات نہیں غاز وغین کی لڑائی ہو گئے، اور اس پر بھی پڑا وبال جب جس کے منتخب ہونے کی امید نہ ہو، وہی جیت جائے۔۔۔جی ہاں ڈونالڈ ٹرمپ، جن کی کامیابی پر مسلمان ہی نہیں، دنیا بھر کے اعتدال پسند لوگوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ موجودہ ہندوستانی وزیر اعظم کی جیت پہلے ہی جمہوری نظام کو منہ چڑھا رہی تھی، یہ دردِ سر اور۔ حالانکہ انتخابات سے قبل حالات ڈیموکریٹک پارٹی کی امیدوار ہلیری کلنٹن کے حق میں سازگار نظر آرہے تھے، عوام سے لے کر سماجی کارکنان، ادیب، فلمی دنیا کے گلوکار اور فنکار سبھی ہلیری کلنٹن کے حق میں اپنے طور سے تشہیری کوششیں کررہے تھے، مگر نتائج نے سب کو دم بخود کر دیا۔ مگر جلد ہی اس دم بخودی کو سر سے اتار، نعرے، مظاہرے اور سوشل میڈیا وغیرہ پر بدستور مقابلہ جاری رہا۔ اس مقابلے میں جس طبقہ پر ہم یہاں خصوصی تذکرہ کریں گے وہ سنیما کے فن سے جڑے فنکار ہیں۔ فن (Art) انسانی تہذیب و ثقافت کا اظہار ہے، اور ثقافت عوام کے طرز زندگی سے مرتب ہوتی ہے، آج کے دور کا مقبول عام فن یعنی سنیما بھی اسی سے عبارت ہے۔ سنیما کو جب ہم آج کا مقبول ترین فن کہتے ہیں تو فطری طور پر اس فن کو برتنے والے فنکار بھی حصے میں مقبولیت پاتے ہیں اور سماج پر اپنا خاصا اثر رکھتے ہیں۔ اپنے اسی اثر و رسوخ کا حق ادا کرتے ہوئے ہالی ووڈ (امریکی فلم انڈسٹری) کے فنکاروں نے ڈونالڈ ٹرمپ کے غیر سنجیدہ، نسل پرستانہ اور فسطائی خیالات پر سخت تنقید کی۔ اس گفتگو میں اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ حالیہ سنیما انڈسٹری کن عمومی اقدار کی پاسدار ہے، ہم یہ مانتے ہیں فنکار کو اپنے سماجی حلقہ اثر کے لحاظ سے، سماجی حالات کے تئیں حساس ہونا چاہیئے۔

بات کریں امریکی فنکاروں کی، تو ہالی ووڈ کی مشہور فنکارہ میرل اسٹریپ نے گولڈن گلوب ایوارڈ کی تقریبات میں نو منتخب امریکی صدر کے غیر سنجیدہ رویہ (ایک معذور صحافی کی تضحیک

کرنے) کی جس طرح مذمت کی، وہ قابل تعریف ہے۔ اپنے بیان میں انہوں نے کہا کہ بے لاگ صحافت اور صحافیوں کی حفاظت کی ضرورت ہے جو کہ ٹرمپ کے اس دور حکومت میں محفوظ نہیں ہیں، مزید اسی تقریب میں ہالی ووڈ فارن پریس ایسوسی ایشن کے صدر لارینز وسوریا نے ٹرمپ کی پالیسیز پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہمیں اپنے رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے شدت، عدم رواداری اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ہالی ووڈ کے بیشتر فنکاروں نے کھل کر بیانات دیئے جس میں لیڈی گاگا، کیٹی پیری، کرس ایوان، سیموئیل جیکسن وغیرہ شامل ہیں۔ میرل اسٹریپ کے بیان پر ڈونالڈ ٹرمپ نے ٹویٹ کرتے ہوئے انہیں Overrated کہا، تو بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ معروف ایوارڈ تقریبات آسکر کی میزبانی کرتے ہوئے ٹی وی فنکار جمی کمیل نے دوران تقریب متعدد مرتبہ ڈونالڈ ٹرمپ کے اس ٹویٹ کے حوالے سے کاری طنز کسے۔ مشہور سیاہ فام امریکی اداکار سیموئیل جیکسن نے اپنے ایک انٹرویو میں ٹرمپ کے نعرے ''امریکہ کو عظیم بنائیں(Make America Great)'' کے حوالے سے کہا اس نعرے کے پس پشت نومنتخب صدر کی نسل پرستی عیاں ہے۔ مزید انہوں نے یہ بھی کہا کہ ڈونالڈ ٹرمپ کی تشہیر کے نتیجے میں مسلمانوں کو اب ملکی سالمیت کے لئے خطرہ محسوس کیا جارہا ہے، اور لوگ اب ان سے کترانے لگے ہیں، حالانکہ مسلمان امریکی سرزمین اور ثقافت کا اٹوٹ حصہ ہیں، جن میں تعلیم کی شرح زیادہ اور جرائم کی شرح سب سے کم ہے۔ یہ بیانات مظہر ہیں اس بات کا، کہ امریکی فنکار اپنے موقف کے بارے میں بے لاگ واقع ہوئے ہیں۔

وہیں بھارتی سنیما کے فنکار اس معاملے میں انتہائی Politically Correct واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ اس معاملے میں بھارتی ادیب حضرات قابل تعریف ہیں جنہوں نے ملک میں بڑھتی عدم رواداری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے حکومتی اعزاز، حکومت کو لوٹا دیے۔ وہیں متعدد صحافیوں نے بھی اس شدت پسندی کے خلاف لوہا لیا۔ حالانکہ جواب میں انہیں ملک دشمن اور دیگر نازیبا القاب نوازا بھی گیا اور ان کے شخصیت کی منفی تشہیر بھی کی گئی۔ مشہور صحافی سواتی چترویدی نے اپنی حالیہ کتاب ''I am A Troll'' میں بتایا کہ حکمراں بھارتیہ جنتا پارٹی، مخالف مشہور شخصیات کے وقار پر سوشل میڈیا کے ذریعے زبانی حملے Troll کی شکل میں کراتی ہے تا کہ لوگ ان کے خلاف بولنا بند کریں۔ سنیما کے فنکاروں میں ایسی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ عامر خان کا ایک بیان جو عدم رواداری کے خلاف نسبتاً ایک لطیف اظہار تھا، جس پر ان خلاف لاکھوں Trolls تیار کئے گئے اور خود بالی ووڈ ہی ان کے اس تبصرے پر دو حصوں میں بٹ گیا۔ بعد ازاں Snapdeal نے انہیں اپنے برانڈ امبیسیڈر کی حیثیت سے برطرف کردیا، اور ان کے مذہبی تشخص کے حوالے سے بھی رکیک حملے کئے گئے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مشہور اداکار شاہ رخ خان کے ساتھ ہوا۔ لیکن ان مخالفتوں کا اثر بجائے اس کے کہ اپنا موقف مزید مضبوطی کے ساتھ پیش کیا جائے، یہ ہوا کہ ان فنکاروں نے احتیاطاً خاموشی اختیار کی، اور سوائے چند معدودے فنکاروں کے تقریباً تمام ہی بڑے فنکاروں نے زبانوں پر تالا لگائے رکھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالیہ دنوں میں نوٹ بندی کے حوالے سے وزیر اعظم کی تعریف کے ذریعے ان فنکاروں نے ان شدت پسند مخالفین کی نظر میں اپنی Image کی استواری کے لئے ایک منافقانہ قدم اٹھایا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہالی ووڈ فنکار، اپنے بیانات کے باعث کوئی مشکل یا مخالفتیں نہیں اٹھاتے، لیکن مشکلات یا نقصانات کے باوجود بھی وہ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ جبکہ بھارتی اداکار محتاط ہونا پسند کرتے ہیں۔ اب شاہ رخ خان کو ہی لے لیجیے، سرجیکل اسٹرائک کے بعد پاکستانی فنکاروں پر لگی پابندی کو لے کر انہوں نے اپنی فلم رئیس (جس میں پاکستانی فنکارہ نے کردار ادا کیا) کے معاشی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے سیاستداں راج ٹھاکرے سے ملاقات کی تا کہ ان کی فلم متشدد مخالفتوں سے بچ جائے، حالانکہ راج ٹھاکرے فی الحال سیاسی منظر نامے پر قوت کے معاملے میں بھی زبوں حالی کا شکار ہیں۔ ہندوستانی فنکاروں اپنے موقف پر مضبوط جمے رہنے والے کچھ نام ضرور ہیں جو انگلیوں پر گنے جاسکتے جیسے مہیش بھٹ، رشی کپور، اوم پوری، سوارا بھاسکر وغیرہ۔ اوم پوری جن کی حال ہی میں وفات ہوئی، نے پاکستانی فنکاروں پر پابندی کے خلاف بے لاگ بیانات دیئے۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں، شو کا میزبان بار باران سے اس معاملے پر جراح کرتے ہوئے ایک ہی بات کررہا تھا کہ ہمارا ایک جوان سرحد پر مارا گیا ہے اور آپ فنکاروں پر پابندی کی مخالفت کررہے ہیں، جواباً اوم پوری نے کہا کہ ''کیا میں نے اسے آرمی میں شریک ہونے کا مشورہ دیا تھا؟'' بس اس جواب پر شدت پسند مخالفین نے انہیں آئی ایس آئی ایجنٹ کی خلعت نواز دی، اور کچھ ہی دنوں کے بعد وہ دل کے دورے سے وفات پا گئے۔ سوارا بھاسکر نے عمر خالد کو مخاطب کر کے ایک بڑا ہی خوبصورت خط لکھا، جس میں انہوں نے فسطائی مزاج پر طنز کئے۔ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ہر ایک پہلو سے اس معاملے میں جے این یو اور ہندوستانی فسطائی سماج کا معروضی انداز میں محاکمہ کیا۔

ہندوستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن کہلائے جانے والے ان فنکاروں کو اپنے ذاتی مفاد کے برخلاف حق کی طرفداری کا مظاہرہ امریکی فنکاروں سے سیکھنے کی ضرورت ہے، اپنے موقف کے سلسلے میں انصاف پسند عوام کی حمایت انہیں اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اس پر مضبوطی سے جمے ہوں گے، ورنہ آئندہ دنوں میں آزادی اظہار رائے کا معاملہ مزید کٹھن ہوسکتا ہے۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے

ڈاکٹر سلیم خان

ارشادِ ربانی ہے: ''اور ہر گروہ کے لئے ایک میعاد (مقرر) ہے پھر جب ان کا (مقررہ) وقت آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی (بھی) پیچھے نہیں ہٹ سکتے اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں (اعراف ۳۴)''۔ قرآن حکیم میں قوموں کے عروج وزوال کی داستان اصولوں اور مثالوں کے ذریعہ نہایت موثر و دلنشین انداز میں بیان ہوئی ہے۔ پہلے کلام الٰہی برباد ہونے والوں کی صفات بیان کرتا ہے اور پھر ان کے انجام بتاتا ہے۔ اس کے بعد مثالیں پیش کی جاتی ہیں مثلاً سورہ ص کی ابتدائی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نصیحت آموز قرآن کی قسم کھا کر یعنی اسے گواہ بنا کر ارشاد فرماتا ہے: ''بلکہ یہی لوگ، جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں''۔ ہر زمانے کے منکرین بڑے گھمنڈی ہوتے ہیں ۔ وہ اپنی کسی خطا سے سبق سیکھنے کے بجائے ضد پر اڑ جاتے ہیں جس کا مشاہدہ آئے دن ہوتا ہے۔

ان بدبختوں کے انجام بد سے کتاب الٰہی اس طرح آگاہ کرتی ہے: ''اِن سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں (اور جب اُن کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اٹھے ہیں، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا''۔ آگے چل کر انبیاء کی دعوت اور اس کے حق میں دلائل پیش کرنے کے بعد فرمایا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ: ''اِن سے پہلے نوحؑ کی قوم، اور عاد، اور میخوں والا فرعون اور ثمود، اور قوم لوط، اور اَیکہ والے جھٹلا چکے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا''۔ تاریخ انسانی کے اس تاریک باب کو روشن کرنے کے ساتھ اسے حالات حاضرہ سے جوڑ دیا جاتا ہے: ''یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اِسی جگہ شکست کھانے والا ہے''۔ رب کائنات کی یہ سنت زمان ومکان کی قیدو بند سے آزاد ہے۔ وہ ہر زمانے میں اور ہر مقام پر نافذ ہو کر رہتی ہے۔ وہ بلا تفریق وامتیاز اس غالب ودانا فرمانروائے کائنات کا اذن ہے جس کے آگے سارے نام نہاد حکمراں بے بس ومجبور ہیں ۔ اس لئے بقول اقبال عظمت و کبریائی اسی ذاتِ والاصفات کو زیبا ہے۔

سروری زیبا تو بس اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتانِ آذری

خلافت عثمانیہ کے بعد ملت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ترکی قوم پرستی کے جواب میں عربی اور ایرانی قومیت کو فروغ حاصل ہوا۔ جنگ عظیم کے مغربی فاتحین نے مسلم دنیا کو مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کا تشخص دین اسلام کے بجائے وطن بن گیا۔ علامہ اقبال ان تبدیلیوں کے شاہد تھے۔ قوم پرست یوروپ کی جنگ عظیم میں تباہ کاری سے واقف اقبال جانتے تھے کہ وطن کا حصار ملی اتحاد کو پارہ پارہ

کردے گا اور اس سے نہ صرف امت تباہ برباد بلکہ اسلام کی نعمت عظمیٰ سے محروم ہو جائیگی۔ اسے حکیم الامت نے امت کو واشگاف انداز میں خبردار کیا۔

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

قوم پرستی کے نشے میں چور مسلم حکمراں بظاہر روشن خیال نظر آتے تھے لیکن وہ اسلام کی مخالفت میں بہت شدید تھے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کی شدت پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ اذان ونماز میں بھی عربی کا روادار نہیں تھا بلکہ ترکی زبان پر اصرار کرتا تھا۔ ایران کا رضا شاہ پہلوی بھی اسلام کا شدید دشمن تھا۔ ان ظالم حکمرانوں میں سے ایک بادشاہ اور دوسرا فوجی آمر تھا، ایک شیعہ و دوسرا سنی تھا مگر دونوں اپنی اسلام دشمنی کے سبب مغرب اور امریکہ کے منظور نظر تھے۔ اسی طرح اشتراکیت نواز جمال عبدالناصر جسے غیر جانبدار ممالک کی تحریک میں خاص مقام حاصل تھا اور جو عرب ممالک کی تنظیم کا سربراہ بھی تھا اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ شام کے حافظ اسد اور عراق کے صدام حسین اسکے ہمنوا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں جبر وظلم کے خلاف اسلام کے احیاء کی بڑی تحریکیں مصر، ترکی اور ایران سے اٹھیں بقول صفی لکھنوی۔

اس دین کی فطرت میں قدرت کے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

مشرق وسطیٰ کے زیروبم کو اگر اسلام پسندوں اور اس کے دشمنوں کی کشمکش کے تناظر میں دیکھا جائے تو حالیہ تاریخ نہایت دلچسپ انکشافات کرتی ہے۔ یہاں اسلام پسند سے مراد وہ تحریکات ہیں جو مغرب سے مستعار فاسد نظریات مثلاً قوم پرستی، لادینیت، اشتراکیت اور سرمایہ داری کو مسترد کر کے زندگی کے تمام شعبوں بشمول سیاست میں دین کا نفاذ چاہتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام دشمن وہ عناصر ہیں جو اولاً اسلام کو سیاست سے خارج کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر عملاً مذہب کو زندگی کے تمام شعبوں سے بے دخل کر کے عبادات اور ذاتی زندگی تک محدود کردینے کے قائل ہیں۔ ایران، ترکی اور مصر کے مغرب زدہ حکمرانوں نے اسلامی تحریک کے نظریاتی چیلنج کو بہت جلد بھانپ لیا اور اس کو اپنے اقتدار کیلئے خطرہ سمجھ کر اس کی سرکوبی شروع کردی لیکن وہ اپنے ناپاک مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکے بلکہ ان میں سے ہر ایک کو رسوا ہو کر دنیا سے جانا پڑا۔ اس لئے کہ ارشاد ربانی ہے : اور یاد رکھو،تمہارے رب نے خبردار کردیا تھا کہا اگر شکر گزار بنوگے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفران نعمت کروگے تو میری سزا بہت سخت ہے۔ (ابراہیم ۷)۔

ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے اسلام کی بیخ کنی میں ساری اخلاقی حدود وقیود کو پامال کردیا۔ اس کی موت کے بعد مغرب پرست دانشوروں، فوجیوں، ججوں اور انتظامیہ میں بڑے عہدوں پر فائز افسران نے ظلم وجور کا سلسلہ جاری وساری رکھا اس کے باوجود ترکی کے اندر پھر سے اسلام پسند غالب ہوگئے اور اب ان کی حکومت ہے۔ ایران میں بھی جب اسلامی بیداری آئی تو شاہ ایران نے اسلام پسندوں کے خلاف اسرائیل کی موساد تک کا تعاون لینے سے گریز نہیں کیا لیکن بالآخر اس کو فرار ہونا پڑا اور وہ مصر کے اندر گمنامی کی موت مرا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کو کچلنے کیلئے جس صدام حسین کو امریکہ اور روس نے جنگ پر آمادہ کیا وہ امریکی فوج کشی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ایک زمانے تک اسرائیل کے خلاف یاسر عرفات کے ساتھ ساری مسلم دنیا تھی لیکن آج الفتح کا دبدبہ ختم ہوچکا ہے اور فلسطینی مسلمانوں کی قیادت اسلامی تحریک حماس کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ آج اسرائیل بھی حماس سے خوفزدہ ہے اور ساری دنیا محمود عباس کی بجائے خالد مشعل واسماعیل ہانیہ کو اہمیت دیتی ہے۔

مصر کے جمال عبدالناصر کو اپنی فوجی طاقت پر بہت ناز تھا۔ شام میں اس کا ہم فکر حافظ الاسد برسر اقتدار تھا۔ ان دونوں نے ملک کر بیک وقت اسرائیل پر حملہ کردیا مگر ابتدائی کامیابی کے بعد انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور صحرائے سینا ہاتھ سے نکل گیا۔ اس ناکامی نے عرب دنیا میں ناصر کو بے وزن کردیا موت سے قبل اسے عربوں کی سربراہی سے معزول کردیا گیا۔ اس کا وارث انور سادات سوویت کیمپ سے نکل کر امریکی کیمپ میں شامل ہوگیا اور اسرائیل سے معاہدے کے سبب قتل کردیا گیا۔ انور سادات کا دست راست حسنی مبارک عوامی احتجاج کے نتیجے میں رسوا ہو کر گیا اور اولین غیر جانبدارانہ انتخابات تینوں مرحلوں میں وہی اخوان المسلمون کامیاب رہی جسے مغرب نوازوں نے نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی فرمان خداوندی ہے: "کہو! خدایا! مُلک کے مالک! تو جسے چاہے،حکومت دے اور جسے

> دنیا بھر میں تحریکات اسلامی کم وبیش ان حالات سے دوچار ہیں جن سے نبی کریمؐ مکہ مکرمہ میں نبرد آزما تھے۔ کبھی ان پر دباو ڈالا جاتا ہے تو کبھی ان سے مفاہمت کی کوشش کی جاتی ہے۔

چاہے، چھین لے جسے چاہے، عزت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے بھلائی تیرے اختیار میں ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے(آل عمران ۲۶)''۔

مصر کے اسلامی انقلاب کا تختہ سازش اور فوجی بغاوت سے الٹ دیا گیا اس لئے کہ اس سے اسرائیل، عرب حکمراں اور ان کے مغربی آقا خوفزدہ ہو گئے۔ اسلامی بہار سے قبل جزیرۃ العرب کے حکمران اسلامی تحریکات کو اپنے اقتدار کیلئے خطرہ نہیں سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مصر و شام کے معتوب اخوانیوں کو سعودی عرب، کویت، امارات اور قطر میں پناہ مل جاتی تھی۔ جزیرۃ العرب میں تعلیمی ترقی، طبی سہولیات، معاشی استحکام، بلدیاتی نظام اور دینی بیداری میں اخوانی اساتذہ اور دانشوروں کے کردار سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مصر میں اخوانی حکومت کے بعد مسلم حکمرانوں کو یہ خوف دلایا گیا کہ یہ اسلامی لہر ان کو تخت و تاج سے بے دخل کر دے گی۔ اس لئے وہ اخوانیوں کو اقتدار سے ہٹانے کے کھیل میں شامل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ تیل کی دولت کا بے دریغ استعمال اسلام پسندوں کا ناحق خون بہانے کیلئے کیا گیا اور تختہ الٹنے کے بعد اس پر علی الاعلان مسرت کا اظہار اس آیت کی مصداق کیا گیا: ''اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراخی کر دیتا تو وہ زمین میں فساد کرنے لگتے لیکن اللہ جس قدر چاہتا ہے اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے''۔ (الشوریٰ ۲۷)

اس سازش میں شامل ہونے والوں کے لئے نعمتوں کی ناقدری بے برکتی بن گئی۔ تیل بھاؤ ایسے گرے کہ دولت نشہ کافور ہو گیا۔ اس پر یمن کی جنگ نے نہ صرف خزانہ خالی کیا بلکہ مزید رسوائی سے دوچار کیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فی الحال یمن کی راجدھانی سناء بظاہر کمزور نظر آنے والے حوثیوں کے قبضے میں ہے اور بزورِ قوت حوول کا امکان مفقود ہے۔ جس امریکہ کی شہہ پر مصر میں تختہ الٹا گیا تھا اس نے ۱۱ ستمبر کے نقصان کی بھرپائی کا قانون بنا کر سعودی عرب کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد مرسی کو اقتدار سے ہٹا کر جس عبدالفتاح السیسی کو اقتدار میں لایا گیا تھا اس سے چند غیر آباد جزیروں کو لے کر تعلقات بے حد خراب ہو گئے۔ اسلام پسندوں کے خلاف ایک دوسرے کی ہمنوائی کرنے والے سعودی حکمراں اور السیسی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔

ایران کو مشیت نے ایک عرصہ تک مغرب کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا۔ جنگ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی معاشی مقاطعہ کے باوجود وہ مستقل حماس اور فلسطین کی حمایت کرتا رہا۔ اس کی پرورش کردہ حزب اللہ نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا دیئے اور حمایت یافتہ حوثیوں کو بھی کامیابی ملی لیکن شام کے اندر ایران کے رہنماؤں نے خود اپنے پیر پر کلہاڑی چلا دی۔ ساری دنیا میں مستضعفین کی حمایت کا دم بھرنے والے شام میں اسلام پسندوں کے بجائے ظالم بشار الاسد کے ساتھ ہو گئے۔ روس جب اپنے فوجی اڈے کو بچانے کی خاطر شام کی سرزمین پر آسمان سے بم برسا رہا تھا تو زمین پر حزب اللہ کے جنگجو شیطان لعین بشار کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر علی الاعلان مظلوموں کا ناحق خون بہا رہے تھے۔ قومی مفاد نے ایرانی حکمرانوں کو ان کے فرضِ منصبی سے غافل کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ''رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیت کو جھٹلا دیا ہے، تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے'' (اعراف ۱۸۲، ۱۸۳)

ترکی نے جب روسی طیارے کو مار گرایا تو دونوں پڑوسی ممالک کے تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے لیکن فوجی بغاوت کی ناکامی کے بعد ترکوں نے امریکہ سے قطع تعلق کر کے روس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور شام کے مسئلہ میں وہ ایک اہم فریق بن گیا جس سے ایران کی سیاسی بساط سمٹ گئی۔ ایران کی مرضی کے خلاف ترکی روس کو جنگ بندی پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایران پر لگی اقتصادی پابندیاں جب ختم ہوئیں تو مغرب ایران کے اسی طرح کے قصیدے پڑھنے لگا جیسے دہئی کے پڑھا کرتا تھا اور ایرانی وزیر خارجہ نے داعش کی دہشت گردی کیلئے سعودی عرب کو اسی طرح ذمہ دار ٹھہرا دیا جیسے کہ کبھی سعودی حکمراں اسلامی شدت پسندی کیلئے ایران کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے لیکن امریکہ اور ایران کی دوستی کے دن اوبامہ کے ساتھ لد گئے۔

ڈونالڈ ٹرمپ کے اقتدار میں آتے ہی امریکی انتظامیہ نے عربوں کے ساتھ پینگیں بڑھانی شروع کر دیں اور ایران پر شکنجہ کا راگ الاپنے لگے جس سے ایرانی حکمرانوں کا دماغ ٹھکانے آ گیا اور وہ پھر سے مسلم ممالک کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ ایران کے صدر ڈاکٹر حسن روحانی شاید اپنے دورِ اقتدار کے اختتام پر اس کیفیت سے نکلنا چاہتے ہیں جس کی بابت ارشاد ہے: '' پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے انکے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔'' (انعام ۴۴)

ایران کے صدر کا حالیہ عمان، کویت اور پاکستان کا دورہ مسلم دنیا کے اندر باہمی احترام وتعاون اور اتحاد و اعتماد کی فضا بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ خلیجی تعاون کی کونسل کے ارکان نے بھی اس اقدام کا خیر مقدم کیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے مسلمان ممالک قومی اور ذاتی مفادات سے اٹھ کر اسلامی اخوت کا باہمی رشتہ استوار کریں۔ اپنے تنازعات کو باہم گفت و شنید سے حل کریں اور کسی دشمن کو اس کا فائدہ اٹھا کر امت کی معیشت اور قیمتی جانوں کو ضائع کرنے کا موقع نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بیش بہا مادی نعمتیں عطا کی ہیں اور ایمان کی جس نعمت عظمیٰ سے نوازہ ہے اس کی ناقدری سے بچیں اس لئے نبیٔ رحمتؐ کا رشاد ہے: ''نافرمانیاں نعمت کو یوں کھا جاتی ہیں جیسے آگ لکڑی کو۔ جب تو دیکھے کہ نافرمانی کے باوجود تم پر نعمتیں پوری طرح نازل ہو رہی ہیں تو تجھے ڈرنا چاہیے کہ یہ استدراج ہو سکتا ہے''۔

دنیا بھر میں تحریکات اسلامی کم وبیش ان حالات سے دوچار ہیں جن سے نبی کریمؐ مکہ مکرمہ میں نبرد آزما تھے۔کبھی ان پر دباو ڈالا جاتا ہے تو کبھی ان سے مفاہمت کی کوشش کی جاتی ہے۔مفسرین نے سورہ صٓ کا یہی پس منظر بیان کیا ہے۔اس سورہ میں پہلے خالق کائنات اپنے حبیب مکرمؐ کی ڈھارس بندھاتا ہے:''اے نبیؐ،صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں''۔اس کے بعد حکم دیا کہ ان سرکش و باغی حکمرانوں کے مقابلے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ایک فرمانبردار فرمانروا کی صفات عالیہ سے انہیں آگاہ کرو:''اور اِن کے سامنے ہمارے بندے داؤدؑ کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔پرندے سمٹ آتے اور سب کے سب اُس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے''۔

حضرت داودؑ کوئی گوشہ نشین بزرگ نہیں تھے بلکہ ان کی بابت یہ بھی فرمایا کہ:''ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی''۔اس تعارف کے بعد حضرت داوؑد کے سامنے پیش ہونے والے ایک قضیہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا گیا اور خلاصہ کلام اس طرح بیان ہوا کہ:'' (ہم نے اس سے کہا)"اے داؤدؑ، ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے،لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔اس آیت میں جہاں حق کے ساتھ حکومت کرنے کی تلقین ہے وہیں خواہش نفس کے چوردروازے کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے جہاں سے شیطان داخل ہوکر اپنی پیروی کرواتا ہے۔ اسی کے ساتھ خواہش نفس پر لگام لگانے کیلئے اپنے خلیفہ ہونے کا استحضار اور یوم الحساب میں جوابدہی کا احساس بھی پیدا کیا گیا۔

سورہ صٓ کے اختتام میں تخلیق آدم کا واقعہ اور شیطان کی سرکشی بیان کی گئی ہے۔ شیطان کے انکار و نافرمانی کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی کہ:''مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا''۔اور پھر راندۂ درگاہ ٹھہرنے کے بعد شیطان کی طلب کردہ مہلت کا ذکر اس طور پر کیا گیا کہ:''وہ بولا اے میرے رب، یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس وقت تک کے لیے مہلت دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔فرمایا، اچھا، تجھے اُس روز تک کی مہلت ہے۔جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔اس نے کہا تیری عزت کی قسم، میں اِن سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا بجز تیرے اُن بندوں کے جنہیں تو نے خالص کر لیا ہے۔'' شیطان چونکہ خود گھمنڈی ہے اس لئے وہ حکمرانوں کو بہ آسانی تکبر کے جال میں پھنسا لیتا ہے۔

شیطان کی بابت قرآن حکیم بارہا خبردار کرتا ہے کہ وہ انسانوں کا کھلا دشمن ہے۔ ابلیس حکمرانوں کو اقتدار بچانے کیلئے ظلم وستم کی حکمت عملی سجھاتا ہے اور وہ اسے اپنا خیر خواہ سمجھ کر جبر وظلم کی راستے پر چل پڑتے ہیں۔ یہ تباہی کا راستہ بالآخر ان کو اقتدار سے محروم کر دیتا ہے لیکن جس وقت انہیں اس کا احساس ہوتا ہے بہت دیر ہوچکی ہے۔اس انجام بد سے بچنے کی واحد سبیل یہ ہدایت ہے کہ:''اے ایمان لانے والو!تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔جو صاف صاف ہدایات تمہارے پاس آچکی ہیں، اگر ان کو پالینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی، تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے(البقرہ۲۰۸، ۲۰۹)۔حکمراں طبقہ جب تک اپنے آپ کو اللہ کا خلیفہ اور اقتدار کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے شیطان کی چالوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔اس شعور کے کمزور ہوجانے پر وہ اپنے دشمن کیلئے نرم چارہ بلکہ اس کا آلۂ کار بن جاتا ہے۔جب وہ شیطان کے فریب میں آکر طاوس رباب پر فریفتہ ہوجاتا ہے تو اس کے شمشیر وسناں کا ہدف دشمن کے بجائے دوست بن جاتے ہیں حالانکہ اس کی یہ صفت بتائی گئی تھی کہ:''۰۰۰۰ (وہ) کافروں پر بہت سخت اور زور آور ہیں آپس میں بہت نرم دل اور شفیق ہیں ۰۰۰۰۰''(فتح ۲۹)۔اس دورِ پرفتن میں امت کی کامیابی کا دروازہ اسی شاہ کلید سے کھل سکتا ہے بقول اقبال ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اعلان ملکیت ماہنامہ رفیق منزل

FORM 4

See Rule-8

مقام اشاعت	۳۲۰، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵
نوعیت	ماہنامہ
پرنٹر، پبلشر	تنویر عالم
قومیت	ہندوستانی
پتہ	E-7، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵
ایڈیٹر	ابوالاعلیٰ سید
پتہ	۳۲۰، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵
ملکیت	اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

(دستخط)

تنویر عالم (پرنٹر، پبلشر)

نازآفرین

حقوق العباد کی اہمیت

انسانی رشتوں کے حقوق کی ادائیگی اور اس کی پاسداری میں ہی زندگی کی اصل خوب صورتی ہے۔رشتوں میں پائیداری کے لیے بے لوث محبت اور پرخلوص خدمت از حد ضروری ہیں ۔ خداوند کریم نے جہاں ان رشتوں کی پاسبانی کی ہدایت کی ہے، وہیں ان کی اہمیت اور مرتبے بھی واضح کردیئے ہیں ۔ بنی آدم کو رب کائنات نے بنیادی طور پر دو طرح کے حقوق دیئے ہیں ۔ پہلا حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد۔حقوق العباد کی حفاظت ،اس کی ادائیگی اور تکمیل کا راستہ قرآن و حدیث کے اطاعت وپیروی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

والدین کے حقوق : قرآن مبین میں تقریباً سات مقامات پر والدین کے حقوق پر احکام آئے ہیں ۔والدین وہ عظیم ہستیاں ہیں جن سے ہماری جنت اور جہنم ہیں۔اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کی تاکید کی ہے ۔ حقوق اللہ کے بعد بندوں کے حقوق میں سرفہرست اطاعت وفرماں برداری والدین کی ہے۔ان کے مقام ،مرتبہ،عظمت اور فضیلت کا بیان متعدد مقام پر کیا گیا ہے۔حدیث پاک ہے:''ایک آدمی نے رسول اللہؐ سے پوچھا:اے اللہ کے رسولؐ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس نے کہا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں، اس نے کہا پھر کون؟ تو آپؐ نے فرمایا، تیرا باپ پھر درجہ بہ درجہ جو تیرے قریب لوگ ہیں۔'' (بخاری، مسلم، متفق علیہ)

اس حدیث پاک سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ماں کا درجہ باپ سے بڑا ہے۔اس لیے کہ ولادت کے دوران عورت ایک قسم کے تخلیقی مراحل سے گزرتی ہے۔اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ والد کی اہمیت کم ہے ۔والد جنت کے دروازوں میں ایک دروازہ ہے ۔ ان کی عظمت کا بیان کون کرسکتا ہے کہ جن کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنا بھی باعث اجر و ثواب ہے۔

والدین کی اہمیت اس حدیث سے بالکل واضح ہے :

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، پوچھا گیا کس کی ناک یا رسول اللہؐ؟ سرکارؐ نے فرمایا جس نے بڑھاپے میں اپنے والدین کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو پایا اور پھر جنت کا حق دار نہ بنا۔'' (مسلم: ۴۲۹۳)

حقوق زوجین : اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حقوق زوجین پوری طرح کھول کھول کر بیان کردیا ہے (سورہ النساء:۱، سورہ الروم:۲۱ اور سورہ البقرہ:۱۸۷)۔ اس بیان کا مقصد ہی یہی ہے کہ کسی کی حق تلفی اور دل آزاری نہ ہو۔اس رشتے کا آغاز ہی اعتماد کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔دونوں کے باہمی تعاون سے ہی گھر کا سکون بحال رہ سکتا ہے ۔ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے میں دونوں فریقین کو ایک دوسرے پر یقین بے حد ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ نے شوہر کو قوام اور بیوی کو محکوم کا درجہ عطا کیا ۔قرآن میں ان دونوں کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے ۔لباس سے مراد ایک دوسرے کی اچھائیوں کو سمجھنا ہے اور کمزوریوں کی پردہ پوشی کرنا ہے، ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ دونوں کو برابر حقوق حاصل ہوں، اگر ایسا نہیں ہوتا تو ادنا و اعلا لباس کا لفظ استعال ہوتا۔اس رشتے میں ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔زوجین کے مرتبے کے سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہو۔آپؐ نے فرمایا:''اگر میں کسی کو دوسرے کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔'' (ترمذی شریف:۳۱۱۶)

مذکورہ حدیث سے شوہر کی اہمیت ثابت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز بھی نہیں کہ خاوند صرف اسی بات کو بنیاد بنا کر حاکمیت چلانے لگ جائیں بلکہ شوہر کے جو اوصاف اسلام میں بتا دیئے گئے ہیں اسے ملحوظ رکھیں۔حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں :

''رسول اللہؐ نے فرمایا: تم میں کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔'' (ترمذی شریف: ۳۱۲۵)

اسی طرح قرآن کریم میں متعدد مقامات پر انھیں ان کے حقوق کی یاد دہانی کرائی گئی ہے اور بعض مقامات پر تنبیہ بھی کیا ہے۔ اسی بنیاد پر انھیں راعی کہہ کر بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ حدیث پاک: ''کسی نے رسولؐ سے پوچھا: کون سی عورت سب سے اچھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ کہ جب خاوند اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو جائے، وہ حکم دے تو اس کی تعمیل کرے اور اپنی جان و مال کے معاملے میں ایسی کوئی بات نہ کرے جو شوہر کو ناپسند ہو۔'' (نسائی: ۳۱۳۲، بیہقی)

دوسری حدیث میں بیان ہے: ''حضرت اُم سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا شوہر اس سے راضی اور خوش تھا تو وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو سکتی ہے۔'' (ترمذی شریف: ۳۱۱۷)

اللہ نے عورت کو ماں ہونے کی حیثیت سے فضیلت عطا کی ہے تو دوسری جگہ مرد کو شوہر ہونے کی وجہ سے عورت سے ایک درجہ بلند رکھا ہے۔ اس طرح دونوں کو ان کا حق مل رہا ہے۔

اولاد کا حق: والدین کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کو اپنی استطاعت کے مطابق کھانا کھلائیں، پہنائیں اور ان کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ اللہ نے خصوصی طور پر والدین کو مخاطب کیا ہے کہ تم اپنے ماتحت کو رزق حلال کھلاؤ۔ بیٹا اور بیٹی کا فرق بالکل بھی نہ کرو۔ رزق کے ڈر سے نہ انھیں قتل کرو اور نہ ان کے ساتھ بدسلوکی کرو۔ اصل میں والدین صرف ایک ذریعہ ہیں۔ حقیقی کفالت کرنے والا تو خدائے رحمن ہے۔ جو صاف صاف کہتا ہے کہ رزق دینے والا میں ہوں۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ: ''حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا: اجر و ثواب کے اعتبار سے وہ دینار بہتر ہے جو تم اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے ہے۔'' (مسلم: ۱۸۳۶)

۔ دوسری حدیث اس طرح ہے، حضرت انسؓ راوی ہیں: ''اللہ کے رسولؐ نے فرمایا جس نے دو بیٹیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گئیں تو قیامت کے دن وہ آئے گا۔ ہم اور وہ اس طرح ہوں گے۔ آپؐ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملایا۔'' (مسلم شریف: ۴۷۶۱)

اسی رشتے کی ایک اہم کڑی بھائی بہن کا تعلق ہے جو نہایت مقدس اور پاکیزہ ہے۔ اس رشتے کی بھی عظمت کھلی ہوئی ہے۔ بھائی کو بہن کے لیے اس کا مان ہونا چاہیے اسی طرح بہن کو بھی بھائی کے لیے اس کا فخر بننا چاہیے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے نمانہ بنیں۔ موجودہ حالات اس کے برعکس ہیں۔

پڑوسیوں کا حق: اللہ کے نبیؐ نے ہمیشہ اپنے گھر والوں اور صحابۂ کرام کو پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلے میں عمدہ نصیحتیں کی ہیں۔ ان کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کی ترغیب دی ہے۔ یہی بات امت مسلمہ پر بھی لازم آتی ہے۔ اس لیے کہ چھوٹی بڑی پریشانی میں پہلے پڑوسی شامل ہوتے ہیں، بعد میں رشتہ دار آتے ہیں۔ دو بھائیوں سے پہلے دو پڑوسیوں کا حساب لیا جائے گا۔ ایک مسلمان کو یہ زیبا نہیں دیتا کہ وہ خود پیٹ بھر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سو جائے۔ حدیث پاک ہے: ''حضرت عائشہؓ اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جبریلؑ ہمیشہ مجھے ہمسایہ کے بارے میں وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ وہ عنقریب اسے وارث بنا دیں گے۔'' (متفق علیہ: ۴۷۴۵)

رشتہ داروں کے حقوق: حقوق العباد کی ایک اہم کڑی رشتہ داروں سے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ان کے ساتھ ادب اور تمیز سے بات کرنا ہے۔ ان کے ساتھ نرمی اور صلہ رحمی کا معاملہ کرنا ہے تاکہ رشتوں میں حسن اور محبت قائم رہے۔ اس میں مضبوطی اور پائیداری رہے۔ اس طرح سے پیش آنے کے باوجود بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگلا شخص بدظن ہو۔ اچھائی کا جواب برائی سے دے۔ ان حالات میں صبر کرتے ہوئے حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے والوں کو دوہرا اجر ہے۔ ان رشتوں کی اہمیت کا اندازہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ: ''حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: وہ سچا صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو بدلے میں صلہ رحمی کرے۔ اصل صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ رشتہ دار اس سے کٹیں تو وہ ان سے جڑے۔'' (بخاری شریف: ۴۷۰۴)

ایک اور حدیث نے تو اس رشتے کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے: ''ایک آدمی نے رسول اللہؐ سے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ جن کے حقوق میں ادا کرتا ہوں اور وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حلم و بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت برتتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو کہتا ہے تو گویا تو ان کے چہروں پر سیاہی پھیر رہا ہے اور اللہ ان کے مقابلہ میں ہمیشہ تیرا مددگار رہے گا جب تک تو اس حالت پر قائم رہے گا۔'' (مسلم، ابو ہریرہؓ)

خادم کے حقوق: عرب میں عام رواج تھا کہ غلاموں سے کام کرائے جاتے تھے۔ ان غلاموں کے ساتھ بعض لوگ نرمی کے ساتھ پیش آتے تھے اور بعض افراد بے جا سختی کرتے تھے۔ ان کی اپنی کوئی زندگی نہیں تھی۔ ان کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدترین سلوک کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اللہ کے پیارے رسول محمدؐ نے خادموں اور غلاموں کے ساتھ شفقت اور محبت کا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ آپؐ کی پیاری صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کو جب اللہ نے خادمہ رکھنے کی توفیق دی تو ایک دن خادمہ کام کرتی اور دوسرے دن خود خاتون جنت گھر کا کام انجام دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ آپؐ نے موت سے قبل جو الفاظ جاری

کیے۔ ان میں لفظ ''غلام'' بھی تھا۔حدیث پاک کا حصہ ہے کہ: ''غلاموں کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسے وہی پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے، اور اس پر کام کا اتنا بوجھ ڈالے جو اس کی طاقت سے باہر نہ ہو، اور اگر اس پر ایسے کام کا بوجھ ڈالے جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور وہ اسے نہ کر پا رہا ہو تو اس کام میں اس کی مدد کرے۔'' (بخاری، مسلم، ابو ہریرہؓ)

بیوہ و یتیم کے حقوق: اسلام واحد مذہب ہے۔جس نے حقوق نسواں کو زمین پر نافذ کیا۔ اس کی پوری حفاظت کی۔معاشرے میں خواتین کو ان کا مقام اور جائز پناہ ملی۔جس نے برائیوں کو پھیلنے کا موقع کم کر دیا۔اسی طرح یتیم بچوں کی کفالت کا بھی بہترین انتظام کیا۔اس حکیمانہ نظام نے ایک ساتھ بیوا اور یتیم دونوں کی کفالت کا مسئلہ حل کیا۔یتیم کی کفالت یا سرپرستی کرنے والے کو اللہ پسند کرتا ہے ۔اس کے ولی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے بالغ ہونے تک اس کے جان و مال کی حفاظت کرے ،اسے ستائے نہیں بلکہ رحم دلی سے پیش آئے ۔ اسی میں دونوں کی خیر و بھلائی کا عنصر پوشیدہ ہے۔بقول رسول اللہؐ کہ: ''سہل بن سعدؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: میں اور یتیم کا سرپرست نیز دوسرے محتاجوں کا سرپرست ہم دونوں جنت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے بیچ کی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا اور ان دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔'' (بخاری شریف)

مسکین ، محتاج اور فقیر کا حق: یہ معاشرے کا وہ طبقہ ہے جسے عموماً غریب کہا جاتا ہے ۔جن کے پاس زندگی گزارنے کے وسائل نہیں ہوتے ہیں۔ان کے پاس پیٹ بھر کھانا اور سر پر سایہ نہیں ہوتا ۔ایسے لوگ بالخصوص مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ غیر مسلموں کے یہاں ان کی تعداد نصف ہے۔اس کی وجہ بھی خاص نہیں بلکہ عام ہے کہ انھوں نے محنت کرنی چھوڑ دی اور ہاتھ پھیلانا شروع کر دیا۔اب مسلم سماج میں ان کی پہچان بہت مشکل ہو گئی ہے کہ واقعی ان میں کون ضرورت مند ہے اور کون غیر ضرورت مند۔بہرحال یہ کام اجر و ثواب کا ہے شک ہے لیکن یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں حق دار کا حق تو نہیں مارا جا رہا ہے۔اس سلسلے میں بھی ایک حدیث پاک دیکھتے چلیں: ''حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا فرمان رسولؐ ہے کہ: اللہ عزوجل قیامت کے دن کہے گا۔اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے نہیں کھلایا۔تو وہ کہے گا اے میرے رب! میں تجھے کیوں کر کھلاتا جب کہ تو سب لوگوں کی پرورش کرنے والا ہے؟ اللہ کہے گا کہ کیا تجھے خبر نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے نہیں کھلایا؟ کیا تجھے خبر نہیں کہ تو اس کو کھلاتا تو اپنے کھلائے ہوئے کھانے کو میرے یہاں پاتا؟ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے مجھے نہیں پلایا۔تو وہ کہے گا۔اے میرے رب! میں تجھے کیسے پلاتا جب کہ تو خود رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے پانی نہیں دیا اگر تو اس کو پانی پلاتا تو وہ پانی میرے یہاں پاتا۔'' (مسلم شریف)

دراصل یہ کھانا کھلانا ، پانی پلانا ،روپے پیسے یا دوسری چیزوں سے مدد کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔یہ تو ان کا حق ہے جو اللہ ہمارے ذریعہ کراتا ہے۔اللہ کو وہ ہاتھ بہت پسند ہے جو دینے والا ہو، لینے والا نہیں، یعنی اوپر والا ہاتھ نیچے والے سے بہتر ہے۔

مسافر کا حق: جو شخص کسی قافلہ یا سفر میں ہو اسے چاہیے کہ اپنے ساتھ جو مسافر ہیں۔ان کا خیال رکھے ۔ضرورت کی چیز مانگنے پر منع نہ کرے۔اپنے اخلاقانہ اثرات اس پر چھوڑے کہ مسلمان ہر جگہ اللہ کا بندہ ہوتا ہے ۔ جگہ بدلنے سے اس کی حیثیت نہیں بدلتی ہے ۔حدیث سے ثابت ہے کہ: ''قوم کا سردار اُن کا خادم ہوتا ہے، تو جو شخص لوگوں کی خدمت کرنے میں سبقت لے جائے تو لوگ اس سے کسی عمل کی بدولت نہیں بڑھ سکتے بجز شہادت کے۔'' (مشکوٰۃ، سہل بن سعدؓ)

مسلمان کا مسلمان پر حق: ایک مسلم دوسرے مسلم بھائی کے لیے ستون کی حیثیت رکھتا ہے ۔جب ایک کسی پریشانی و مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے حوصلہ دیتا ہے۔اسے صبر کی تلقین کرتا ہے۔اس کی خوشی اور اس کے غم میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ایک مومن کی یہی خوبی بتائی گئی ہے کہ وہ طعنہ دینے والا نہیں ہو سکتا۔حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔وہ ہلاکت کو دفع کرنے والا ہوتا ہے ۔حدیث پاک کے مطابق :''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔نہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو ذلیل کرے، نہ اس کی تحقیر کرے۔ تقویٰ یہاں ہے ۔آپؐ نے سینے کی طرف اشارہ کیا ۔آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، مال اور آبرو حرام ہے۔'' (مسلم: ۴۷۰۴)

مہمان اور مریض کا حق: مہمان نوازی مسلمانوں کی قدیم روایت کا حصہ ہے۔یہ آپسی تعلقات کو مضبوط کرتا ہے۔مہمان کو چاہیے کہ وہ تین دنوں تک ہی مہمان نوازی کرائے ورنہ میزبان کو تکلیف ہو سکتی ہے۔ کوئی رشتہ دار یا مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت بھی ضروری ہے۔بیمار کی عیادت کرنے والے کے لیے سمندر کی مچھلیاں اور ستر ہزار فرشتے دعا کرتے ہیں۔حدیث کے مطابق: '' مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو اس کے وہاں سے واپس آنے تک وہ جنت کے باغ میں سیر کرتا ہے۔'' (مسلم: ۲۵۶۸)

حقوق العباد کی ادائیگی مرد و زن دونوں پر عائد ہوتی ہے۔اللہ کے یہاں فیصلہ انسان کے اوصاف کی بنیاد پر ہوگا۔جو انسان کسی ظلم کا بارِ گناہ اٹھائے ہوئے آئے گا، خواہ اس نے حق تلفی اپنے خدا کے حقوق پر کیا ہو، خلقِ خدا پر یا پھر اپنے نفس پر، اسے کامیابی نہیں ملے گی۔عدل و انصاف اور محبت و اخوت کا ساتھ دینے والوں کو ہی کامیابی حاصل ہوگی۔ بہتر اور صالح معاشرے کا وجود اسی احترام کا متقاضی ہے۔

اچھی تقریر اور بُرا پروگرام

مبشر الدین فاروقی

پچھلی تحریر میں تقریر کو "برا کرنے" یا "برا بنانے" کے ضمن میں مقرر حضرات کے رول پر بحث کی گئی تھی۔ لیکن اس بات کا اندازہ پہلے بھی تھا اور باعلم حضرات کے مشورے کے بعد خیال مضبوط ہوا کہ تقریر کے بری ہونے کے لیے ہر وقت صرف مقرر حضرات ہی ذمہ دار نہیں ہوتے۔ اچھی تیاری کے ساتھ کی جانے والی تقریر دیگر کئی اسباب کی بناء پر بری بن جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ اسباب منتظمین سے متعلق ہوتے ہیں جس میں پروگرام، پروگرام کاپی، وقت وغیرہ چیزیں شامل ہیں اور بعض دیگر سامعین سے متعلق ہوتے ہیں جن میں ان کی نفسیات، خواہش اور استعداد کا دخل ہوتا ہے۔اس تحریر میں انشاء اللہ ان اسباب سے متعلق احساسات پیش کیے جائیں گے۔

وہ بھرپور اعتماد اور جوش کے ساتھ آڈیٹوریم پہنچا تھا۔اس اعتماد اور جوش کی وجہ وہ تیاری تھی جو اس نے اپنی تقریر کے لیے کر رکھی تھی۔ وہ پچھلے ایک ہفتہ سے اس کی تیاری میں مصروف تھا اور نہایت گہرے مطالعہ، غور و فکر اور ریسرچ کے ساتھ اس نے اپنی تقریر کے نکات تیار کیے تھے۔ پروگرام ہال میں داخل ہونے کے بعد اس کی نظر سامعین پر مرکوز ہوئیں، جن کے مرجھائے ہوئے چہروں نے اس کے جوش کو بری طرح متاثر کیا۔ پروگرام کاپی پر نگاہ ڈالنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ صبح ۱۰ بجے سے جاری اس پروگرام میں کل ۶ تقاریر تھیں اور اس کی تقریر کا نمبر پانچواں تھا۔اس کے بعد صدر مجلس کی جانب سے اختتامی خطاب ہونے والا تھا۔ اعلان کے بعد اس نے اپنی تقریر شروع کی۔ وہ جس جوش و جذبہ کے ساتھ کہہ رہا تھا، سامعین اتنی ہی بے چینی و بیزارگی کے ساتھ اسے سن رہے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ سوالات کے ذریعے، دانستہ طور پر غلط الفاظ کی ادائیگی کے ذریعے سامعین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہر مرتبہ ان کا cold response اسے مایوس کر رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پروگرام میں تقریروں کی بھرمار کی وجہ سے سامعین کے دماغ سن اور حواس گم ہو چکے ہیں اور اس کا اپنی تقریر کو جاری رکھنا بالکل بھی فائدہ مند نہیں ہے۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے ۴۰ منٹ کی تقریر ۲۵ منٹ میں ختم کی۔ اسطرح اچھی تیاری کے ساتھ کی جانے والی تقریر مختلف وجوہات کے باعث "اچھی" ثابت نہ ہو سکی۔

سامع، منتظم اور مقرر کا تعلق:

کسی بھی پروگرام کے تین بنیادی اجزاء ہوا کرتے ہیں۔

۱۔ شرکاء یا سامعین: یہ افراد پروگرام کے اصل مخاطب ہوتے ہیں۔ ان ہی کی ضروریات کی تکمیل کے لیے پروگرام رکھا جاتا ہے۔ قبل از پروگرام اور بعد از پروگرام سامعین کی صورتحال کی بنیاد پر پروگرام کے حاصلات کو ناپا جاسکتا ہے۔

۲۔ منتظمین یا ذمہ داران: وہ افراد جو پروگرام کا انعقاد کرتے ہیں۔ پروگرام کے مقاصد اور اسکی بنیاد پر موضوعات کا تعین کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ پروگرام کی میزبانی کرتے ہیں۔

۳۔مقررین : وہ حضرات جنہیں مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے تقریر، خطبہ، درس وغیرہ کی ذمہ داری دی جاتی ہے۔

یہ تینوں اجزاء باہم مربوط ہوتے ہیں جن کے درمیان صحیح ربط کا قائم رہنا پروگرام کی کامیابی کے لیے ازحد ضروری ہے۔اس ربط میں خلل پیدا ہونے ، دوریاں واقع ہونے اور گڑبڑا جانے کی صورت میں پروگرام متاثر ہوتا ہے۔اس ربط کو مندرجہ ذیل خاکہ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔
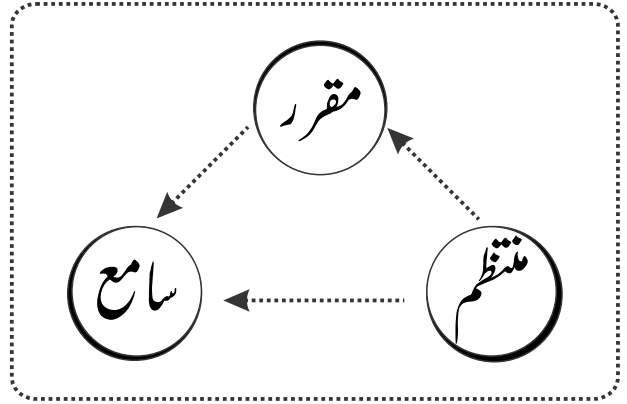
منتظمین سے متعلق:

پروگرام طئے ہونے کے ابتدائی مرحلہ میں سب سے اہم رول منتظم کا ہے۔یہ منتظم کی بنیادی اور سب سے اہم ذمہ داری ہے کہ وہ پروگرام کے ممکنہ شرکاء یا سامعین کی ضروریات سے واقف رہے۔''حقیقی ضرویات'' سے۔اسے شرکاء کی صورتحال کا بخوبی علم ہونا چاہیے۔لوگ کیا سوچتے ہیں، ان کا اندازفکر کیا ہے، وہ ذہانت کے کس معیار پر ہیں، ان کے حقیقی مسائل کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔اس کا تجزیہ بڑی تفصیل کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کے لیے جتنی ضرورت میدان عمل کے حقائق (ground realities) سے واقفیت کی ہے اتنی ہی گہرے علم، حکمت وبصیرت کی بھی۔اس بات کا شعور نہ ہو تو سطحی قسم کے موضوعات پروگرام کا حصہ بن جاتے ہیں جن پر تقریر چاہے کتنی ہی اچھی ہو لیکن چونکہ وہ ''حقیقی مسائل'' کو مخاطب نہیں کرتی اس وجہ سے اس کی افادیت محدود ہو جاتی ہے۔

''حقیقی مسائل'' یا ''حقیقی ضروریات'' کا تذکرہ بار بار اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ کئی مرتبہ افراد مختلف قسم کے مسائل میں گھرے نظر آتے ہیں لیکن اکثر وبیشتر ان مسائل کا منبع ایک ہوا کرتا ہے۔ضرورت اس نبض مسئلہ کو پہچاننے کی ہوتی ہے۔مثال کے طور پر فرض کیجیے تنظیم کا کوئی فرد متحرک نہیں ہے۔وہ مسلسل سستی وکاہلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ذمہ داران کی حکم عدولی کا مرتکب ہو رہا ہے۔کاموں میں اس کی شرکت برائے نام ہے اور دیگر کئی غلطیاں اس سے سرزد ہو رہی ہیں۔ایسے فرد کے حقیقی مسائل دو ہو سکتے ہیں۔اول یا تو وہ فکری طور پر مضبوط نہیں ہے دوم وہ فکری طور پر مضبوط تو ہے لیکن غفلت کا شکار ہے اور ذاتی زندگی میں ترجیحات کے تعین میں غلطی کر رہا ہے۔ایسے فرد کے لیے ہر ایک مسئلہ پر تذکیر کے بجائے 'نبض مسئلہ' کو موضوع بحث بنانا حقیقی ضرورت ہے۔

حقیقی ضروریات سے عدم واقفیت کا ایک نقصان یہ بھی ہیکہ اس کی وجہ سے غیر متعلقہ موضوعات کو پروگرام میں شامل کر لیا جاتا ہے۔اس کی توجیہ میں یہ بات پیش کی جاتی ہیکہ افراد کو فلاں موضوع کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔مثلا کسی کو لگتا ہیکہ موجودہ نظام سیاست اور اسلامی سیاست کا علم ہر شخص کے لیے ضروری ہے، اس لیے اسے پروگرام میں شامل کرنا چاہیے۔کسی کو معیشت کے بارے میں اور کسی کو عالمی صورتحال کے بارے میں ایسا ہی لگتا ہے۔اس ضمن میں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہیکہ علم کی دنیا وسیع تر ہے اور ہر فرد کو اپنی ذاتی خواہش، مطالعہ، دلچسپی کی وجہ سے کچھ چیزیں اہم لگتی ہیں لیکن اگر پروگرام منتظمین کی خواہش اور دلچسپی کی بنیاد پر بننے لگے جس کا سامعین سے دور دور تک واسطہ نہ ہو تو عین ممکن ہیکہ اس پروگرام کی اچھی تقریریں سامعین کے لیے بری ثابت ہوں۔

حقیقی ضروریات کے ادراک اور اس کے مطابق موضوع کے انتخاب کے بعد اگلا مرحلہ اس تفصیل کو مقرر تک پہنچانے کا ہوتا ہے۔مقرر چونکہ راست طور پر سامعین یا شرکاء سے واقف نہیں ہوتا اور نہ ہی دونوں کے درمیان (بیشتر موقعوں) پر کوئی ربط وتعلق ہوتا ہے۔اس لیے منتظم کی اہم ذمہ داری یہ بھی ہیکہ وہ تمام تفصیلات کو احسن انداز میں مقرر تک پہنچائے۔اس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ مقرر سے کیا چیزیں مطلوب ہیں۔مقرر اور منتظم کے درمیان اس رابطہ میں کچھ کمیاں رہ جائیں تو ہوتا یہ ہیکہ مقرر اپنی دانست کے اعتبار سے اچھی تیاری کے ساتھ تقریر کر لیتا ہے۔لیکن منتظمین کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔اس صورت میں مقرر حضرات کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مقرر کے لیے اچھی تیاری کے باوجود اچھی تقریر کرنا اس وقت بھی مشکل ہو جاتا ہے جب پروگرام میں expected audience کے بجائے unexpected audience شریک ہو۔مثلا کوئی لیکچر بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے رکھا جائے اور فی لواقع لیکچر میں عام افراد زیادہ ہوں۔یا کوئی پروگرام بڑی عمر کے طلباء کے لیے ہو اور پروگرام میں چھوٹی عمر کے طلبا شریک ہوں۔اس طرح کہ معاملات میں expected audience کیلیے تیار کی جانے والی اچھی تقریر unexpected audience کے لیے بری بن جاتی ہے۔منتظمین کو اس جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

پروگرام میں تقریروں کی کثرت اچھی تقریروں کی نتیجہ خیزی کو کم کر دیتی ہے۔

ایسے پروگراموں میں اول تو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہےکہ ہر اگلی تقریر پچھلی تقریر کی تاثیر کو کم کردے گی ۔ دوم یہ کہ تقریروں کی کثرت طبیعت کو بوجھل بنا دیتی ہے ۔ سامعین میں اکتاہٹ و بیزارگی کو پیدا کرتی ہے ۔مجموعی حیثیت میں سستی کے غلبے کی وجہ سے سامعین اچھی تقریر پر توجہ نہیں کر پاتے ۔

ایک اہم بات یہ بھی ہےکہ پروگرام شروع ہونے کے بعد درمیان میں موقع کے اعتبار سے تبدیلی کی کھلی گنجائش ہونی چاہیے اور اس کا شعور بھی ۔ضرورت کے مطابق پروگرام میں برموقع تبدیلی کرنا حکمت کا تقاضا ہے۔کیونکہ رسمی طور پر پروگرام کو جاری رکھنا اصل مطلوب نہیں بلکہ اس کی نتیجہ خیزی زیادہ اہمیت کی حامل ہے ۔مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ پروگرام اپنے طئے شدہ شیڈیول کے مطابق جاری ہے، ایسے میں ایک موقع پیش آجائے جہاں سامعین حد درجہ اکتاہٹ کا شکار نظر آئیں اور اگلی تقریر کو سننے کی استعداد نہ رکھتے ہوں، اس وقت شیڈیول کے مطابق پروگرام جاری رکھنا درست نہیں ہوتا، تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ بالعموم منتظمین ایسی تبدیلیوں کے لیے جلد راضی نہیں ہوتے خصوصا بڑے پروگراموں میں ۔ ہمارے کلچر میں ایسے رواج کو فروغ دینے کی ضرورت ہےکہ ہم حسب موقع پروگرام میں بڑی تبدیلی کرسکیں۔

ایک مسئلہ منتظمین کی اس غیر فطری خواہش سے بھی ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ مقرر سے اس بات کی امید کرتے ہیں کہ ان کی تقریر میں content اتنا زیادہ ہو کہ بس حجت تمام ہو جائے اور اس کے بعد سامعین کو اس سے متعلق کسی چیز کو پڑھنے یا سننے کی حاجت باقی نہ رہے۔موضوع کے تمام پہلوؤں کو اس تفصیل سے سمیٹا جائے کہ ہر شخص اس موضوع کا ’عالم‘ بن جائے۔گویا کہ ’’یہ آخری پروگرام ہے ۔اسکے بعد بس قیامت ہی برپا ہوگی ۔اسلیے سارا زم زم ابھی سامعین کے گلے میں انڈیل دو یہ جانے بغیر کہ اس میں کس قدر کی گنجائش ہے ۔‘‘ (ڈاکٹر سلیم خان) اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہےکہ سامعین کے لیے تقریر کسی بھی موضوع پر معلومات کے حصول کی پہلی سیڑھی ہوسکتی ہے، آخری نہیں ۔ایک تقریر کے ذریعے حجت تمام نہیں کی جاسکتی ۔تقریر میں موضوع سے متعلق تشنگی کو برقرار رکھنا سامعین کے ہوم ورک کے لیے بھی ضروری ہے تاکہ ان میں حقیقتا حصول علم کی جستجو اور تڑپ پیدا ہو اور وہ اس کے لیے عملی کوششوں کی طرف توجہ دے ۔

سامعین کے متعلق:

عربی کا ایک مقولہ ہے، ’’ایک آدمی سو اونٹوں کو پانی پلا سکتا ہے لیکن کوئی ایک اونٹ اگر پانی نہ پینا چاہے تو اسے سو آدمی مل کر بھی اسے پانی نہیں پلا سکتے‘‘ ۔اس کا اطلاق ہمارے موضوع پر کیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک مقرر سو سامعین کے لیے علم میں اضافہ اور تحریک کا سبب بن سکتا ہے لیکن وہ سامع جو حصول علم کی ذرہ برابر خواہش نہیں رکھتا نہ ہی اس سے متعلق کسی تحریک سے متاثر ہونا چاہتا ہے اس کے لیے سو مقررین کی اچھی تقریریں بھی نفع بخش نہیں ہوں گی۔

افراد کو اپنی کم علمی و جہالت کے متعلق احساس زیاں ہونا چاہیے اور اسے دور کرنے کی خواہش بھی ۔ یہ خواہش نہ ہو تو اچھی سی اچھی تقریریں بھی بری لگنے لگتی ہیں ۔اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

تقریر کی نتیجہ خیزی کو بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہےکہ سامعین پروگرام سے قبل اس کی کچھ تیاری کرلیں ۔اس تیاری کی وجہ سے موضوع اور پروگرام سے ایک قسم کی وابستگی پیدا ہوتی ہے جسکی وجہ سے تقریر میں توجہ مرکوز رہ پاتی ہے، دلچسپی قائم رہتی ہے ۔ سامعین کی یہ کیفیت مقرر کے جوش میں بھی اضافہ کرتی ہے ۔ اسطرح ’’اچھی تقریر‘‘ فی الواقع ’’اچھی‘‘ ثابت ہوتی ہے ۔

آخری بات یہ کہ ’اچھی تقریر‘ کے بعد سامعین کا کردار ختم نہیں ہوتا بلکہ اصل کام یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق تمام ممکنہ وسائل و ذرائع استعمال کرتے ہوئے علم میں اضافہ کیا جائے اور شخصیت میں نکھار کی شعوری کوشش کی جائے ۔

محمد آصف اقبال

طلباء ایکٹوزم کے پس منظر میں
ظلم وزیادتیوں کے خلاف کشمکش اور

فکری ونظریاتی اختلافات!

راجدھانی دہلی کی جواہرلال نہرو یونی ورسٹی کا طالب علم نجیب احمد گزشتہ 15/ اکتوبر 2016 سے گمشدہ ہے۔ گمشدگی سے قبل اس کی چند طلبا کے ساتھ جھڑپ کے معاملات سامنے آئے تھے۔ شک کی سوئیاں اُنہیں طلبا پر جاتی رہی ہیں اس کے باوجود پولیس اور دیگر تفتیشی ایجنسیوں کی جانچ پڑتال کے بعد ابھی تک ثبوت ندارد ہیں۔ دوسری جانب نہ نجیب ہی مل سکا اور نہ ہی مجرمین کا کچھ حال معلوم ہوسکا ہے۔ وہیں یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ نجیب کی گمشدگی سے قبل جے این یو اسٹوڈنٹ یونین کے صدر کنہیا کمار کو بھی ملک سے بغاوت وغداری کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پھر جس طرح ایک طویل عرصہ سے نجیب کے لیے کوشاں رہنے والے مختلف قسم کی قانونی اور سماجی انصاف کی سرگرمیوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ٹھیک اسی طرح یا اس سے کچھ زائد منظم طریقہ سے کنہیا کمار کی رہائی کے لیے بھی ایک بڑا گروہ سرگرم عمل رہا ہے۔ نیز کنہیا کمار کے واقعہ سے ذرا قبل حیدرآباد یونیورسٹی میں روہت ویمولا کی خودکشی کا دردناک واقعہ بھی سامنے آیا تھا۔ اِس واقعہ نے بے شمار سوالات کھڑے کیے تھے۔ ایک جم غفیر ویمولا کی خودکشی کی وجوہات جاننا چاہتا تھا ساتھ ہی اُن حالات سے نجات چاہتا تھا جن کے سبب روہت ویمولا نے خودکشی کی تھی۔ یہ تینوں ہی واقعات اُن تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے ہیں جن کا مقصد وجود ہی ناانصافیوں کا خاتمہ ہے۔ کیونکہ تعلیم وہ ذریعہ ہے جس کے تحت فرد کو سوچنے سمجھنے کی نئی جہتوں کا علم ہوتا ہے نیز یہ ادارے فرد کے اندر شعور کا ارتقاء کرتے ہیں۔ نتیجہ میں ظلم و بربریت کے خاتمہ، انصاف کے

لیے جدو جہد کرنے ،امن و امان کے قیام کے لیے راہ عمل طے کرنے اور مسائل سے جوجھتے ہوئے راہیں تلاش کرنے کا شعور پروان چڑھتا ہے۔ساتھ ہی اِن تعلیمی اداروں کا دوسرا بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ یہاں کے فارغین معاشرہ اور ملک ، ہر دو سطح پر فرد کی تعمیر و ترقی اور فلاح اور بہود کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ پھر اس سرگرمی عمل ہی کے نتیجہ میں عدل و انصاف کا قیام عمل میں آئے گا۔شاید اِنہیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اِن تینوں ہی واقعات میں سماجی انصاف کے قیام کے لیے سعی و جہد کرنے والے افراد اور اداروں نے موثر کردار ادا کیا ہے۔اس کے باوجود دیکھا جائے تو یہ تینوں ہی واقعات الگ الگ دائروں میں سعی و جہد کرتے نظر آتے ہیں۔کیونکہ ان تینوں ہی واقعات کا سماجی اور نظریاتی پس منظر یکساں نہیں ہے ۔جس کی وجہ سے سماج کے تین طبقات یا نظریات کے حاملین گر چہ کبھی یکساں پلیٹ فارم پر مسائل کے حل کے لیے متحد بھی نظر آئے ہوں،اس کے باوجود ان کا سُر،طریقہ احتجاج اور نعرے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔مثلاً:ایک نعرہ لال سلام کا ہے تو دوسرا جے بھیم اور تیسرا اگر چہ نعرہ نہیں ہے لیکن سوال کی شکل میں یہ بھی لگ بھگ نعرہ سے کچھ کم نہ رہا: 'نجیب کہاں ہے؟ وہ کب ملے گا؟اس کے مجرمین کب پکڑے جائیں گے؟

لال سلام کے بارے میں آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں اور نجیب کہاں ہے یہ کوئی نعرہ نہیں ہے۔لیکن جے بھیم کا نعرہ دلت کیوں لگاتے ہیں؟اس کو جاننا ضروری ہے۔مختصر تاریخ یہ ہے کہ جے بھیم کا نعرہ پہلی بار کورے گاؤں کی جنگ میں یکم/ جنوری 1818ء میں بولا گیا تھا۔ یہ جنگ پیشوا اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہوئی تھی۔ جے این یو کے پروفیسر وویک کمار بتاتے ہیں کہ جنگ کے دوران مہار سپاہی بھیما ندی پار کرنے کے لئے جے بھیم کا نعرہ لگا کر اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے تھے اور مہار فوج

یہ بات مسلمہ ہے کہ فکر و عمل کی دنیا میں بالعموم جمود نہیں ہوتا۔انسانی تجربات معاشرتی ارتقاء کے باعث قائم شدہ نظریات کے عمل سے گزرتے ہیں اور اس طرح فکری ارتقاء کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔اس حیثیت میں اگر عمل بمقابلہ فکر سے کیا جائے تو اصل فکر ہے نہ کہ عمل۔لیکن چونکہ عموماً فکر کی عملی تشریح عمل کے ذریعہ ہی دی جاتی ہے۔ اور دنیا بھی عمل کے نتیجہ میں فکر کی مثبت و منفی تنقید کرتی ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر فکر سے زیادہ عمل کی حیثیت ہو جاتی ہے۔

نے پیشوا کو شکست دے دی تھی۔لہٰذا ڈاکٹر امبیڈکر ہر سال پونے ،مہاراشٹر واقع اُس جگہ جاتے تھے اور مہاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی مثالی بہادری کو خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔پروفیسر وویک مزید بتاتے ہیں کہ 1936ء میں انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی (ILP) کے قیام کے بعد، جب امبیڈکر ممبئی چاپ میں اپنی سالگرہ منا رہے تھے تو ان کے ایک حامی نے بطور سلام جے بھیم بولا،اور اس کے بعد یہ نعرہ فروغ

پاتا گیا۔لیکن باقاعدہ تحریک کے طور پر، جے بھیم کی شہرت امبیڈکر کی موت کے بعد ہوئی اور جے بھیم 1960ء کے بعد ہندی بولنے والے علاقوں میں مقبول عام ہو گیا۔وہیں جے بھیم کی ایک دوسری تفصیل یہ ہے کہ جے بھیم لفظ کے بانی بابو ہر داس ایل این تھے جو 1921ء میں امبیڈکر کے ساتھ سماجی تحریک میں شامل ہوئے۔بابو ہرداس کے ذہن میں اس لفظ کا خیال اس وقت آیا جب انہوں نے ایک مسلمان شخص کو دوسرے مسلمان سے السلام علیکم اور وعلیکم السلام کہتے سنا۔بابو ہرداس نے سوچا کہ ہم دلتوں کو ایک دوسرے سے ملتے وقت کیا کہنا چاہیے؟انہوں نے اپنے کارکنوں سے کہا، میں جے بھیم ' کہیں گے اور آپ بل بھیم ' کہیے۔ اس وقت سے یہ دلتوں کے درمیان بطور سلام جے بھیم شروع ہو گیا، بعد میں بل بھیم ' کا استعمال ختم ہو گیا صرف جے بھیم فروغ پایا۔ 34-1933ء میں بابو ہرداس نے سمتا سینک دل کو جے بھیم' کا نعرہ ناگپور میں دیا۔اس طرح جے بھیم' ہر جگہ فروغ پاتا گیا۔ بعد میں ڈاکٹر امبیڈکر نے خود بھی 1949ء میں اپنے خطوط میں جے بھیم لکھنا اور کہنا شروع کر دیا تھا۔

دوسری جانب اگر آپ لفظ بھیم کے لغوی معنی تلاش کریں تو وہ خوف ناک کے ہیں۔اور بطور کردار بھیم پانڈو کے پانچ بیٹوں میں سے دوسرے بیٹے کا نام بھیم یا بھیم سین تھا۔وہ طاقت ،قد و قامت اور پرخوری کے لیے مشہور تھا۔بھیم میں دس ہزار ہاتھیوں کے برابر طاقت تھی اور وہ چینی جنگ میں ماہر تھا۔ دررودھن کی ہی طرح بھیم نے بھی چینی جنگ کی تعلیم شری کرشن کے بڑے بھائی بلرام سے لی تھی۔مہابھارت میں بھیم نے ہی دررودھن اور دشاسن سمیت گاندھاری کے سو بیٹوں کو مارا تھا۔ دروپدی کے علاوہ بھیم کی بیوی کا نام ہنڈبا تھا جس سے بھیم کا بہادر بیٹا گھٹوتکچ تھا۔گھٹوتکچ نے اندر کے ذریعہ کرن کو دی گئی بے انتہا طاقت کو اپنے اوپر چلوا کر ارجن کی

جان کی حفاظت کی تھی۔ بھیم بے انتہا طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھا باورچی بھی تھا۔ وراٹ نگر میں جب گمنانی کی زندگی گزارتے ہوئے دروپدی ،سورندھری بن کر رہ رہی تھی، دروپدی کی پاک دامنی کی حفاظت کرتے ہوئے اس نے کیچک کو بھی مارا تھا۔شری کرشن کا حتمی دشمن مگدھ نریش جراسنگھ کو بھی بھیم نے ہی مارا تھا۔مہابھارت میں دریودھن کی دھوکہ سے پنڈلی توڑ دی تھی، جس کے صدمہ کی تاب نہ لاکر وہ مر گیا تھا۔ یہ وہ مختصر تعارف ہے جو بھیم کے سلسلے میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں، خصوصاً مہابھارت میں درج ہے۔تعارف میں یہ بات واضح طور پرموجود ہے کہ ' بھیم ایک خالص ہندو مذہبی کردار ہے۔جس کی عقیدت سے برادران وطن سرشار ہیں۔اور چونکہ وہ ایک کمتر پیشہ باورچی سے وابستہ تھا لہذا کمتر پیشوں سے وابستہ افراد اُسے بطور ہیرو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی بہادری، شجاعت، عقیدت اور مذہبی کردار ہونے کے نتیجہ میں ہی وہ جے بھیم کا نعرہ بھی بلند کرتے ہیں۔اردو قارئین اس موقع پر یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ جس طرح ان کے لیے جے شری رام کا نعرہ قابل قبول نہیں ہوسکتا ٹھیک اسی طرح جے بھیم کا نعرہ یا اس سے ملتے جلتے دیگر نعرے بھی قابل قبول نہیں ہیں۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو لوگ یہ نعرے لگاتے ہوں، ان کے ساتھ ہم عدل و انصاف کے قیام کی سعی وجہد میں شامل نہ ہوں۔

ابتدائی گفتگو کے پس منظر میں تین مزید سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔i) سماجی انصاف کے لیے سرگرم عمل رہنے والوں کے نعرے گرچہ مختلف ہوں ،قیام عدل و انصاف کے لیے کیا ان سب کو کامن پلیٹ فارم پر نہیں آنا چاہیے؟ii) کامن پلیٹ فارم پر سعی وجہد کے دوران کیا اپنے مخصوص نظریات اور طریقہ احتجاج (نعرے اور مطالبات) میں امتیاز برقرار رکھنا ضروری ہے یا اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟iii) سماجی انصاف کی لڑائی کسی مخصوص فکر و نظریہ کے حاملین کے خلاف ہے یا ہر اس فرد، گروہ اور نظریہ کے خلاف جو ظلم و زیاتیوں میں ملوث ہے؟ سوالات کے جواب تلاش کیے جائیں اس سے قبل جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی امتیازی خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں کیونکہ متذکرہ تین میں سے ایک واقعہ روہت ویمولا گرچہ حیدرآباد یونیورسٹی سے تعلق رکھتا ہے اس کے باوجود اس کی آواز بھی جے این یو اور اس کے اطراف کافی دنوں تک سنائی دیتی رہی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی جب قائم کی گئی تھی اس وقت وزیر اعظم اندرا گاندھی اسے حکومت کے مختلف شعبوں کے لیے اعلیٰ پیشہ ورافسران کی تربیت گاہ کی یونیورسٹی بنانے کی سوچ رہی تھیں لیکن بعد میں اسے ایک تحقیقی ادارے میں بدلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ابتدا میں حکومت نے جے این یو کے لیے چند بہترین دماغ جمع کیے اور یونیورسٹی کو ایک معیاری اور سائنسی نظریات کے حامل تعلیمی ادارے کے طور پر ترقی دینے کی منصوبہ بندی کی۔کچھ ہی عرصے میں یہ ہندوستان کی ایک باوقار یونیورسٹی بن گئی۔چونکہ جے این یو میں ابتدا سے ہی شعوری طور پر روشن خیال اور بائیں بازو کے رجحانات کے پروفیسر حضرات کی تقرری کی گئی تھی، لہذا یہاں کلاسز اور کلاسز سے باہر بحث ومباحثے کی ایک ایسی روایت قائم ہوئی جو ملک کی کسی دوسری یونیورسٹیوں میں اب تک نہیں ہو سکی ہے۔یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہر اس طالب علم کے آسان کیا گیا جو صرف پڑھنے میں تیز ہو اس کے باوجود کہ وہ معاشی لحاظ سے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔اندرا گاندھی کی قائم کردہ یونیورسٹی کے اندر چاہت کے باوجود طلبہ نے اندرا کو کیمپس میں داخل نہیں ہونے دیا۔اس کی وجہ ایک یونیورسٹی کی امتیازی فضا تھی تو دوسری جانب ایمرجنسی کے لیے معافی کا مطالبہ۔آغاز ہی سے یونیورسٹی میں لبرل خیالات کے اساتذہ اور طلبہ کا غلبہ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دیگر افکار و نظریات کے حاملین اس میں اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے ہیں۔جے این یو کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ کسی نظریے کی تابع نہیں ہے۔یہ روشن خیالی اور سائنسی نظریات اور جستجو کی دانش گاہ ہے۔یہاں طلبہ صرف تعلیم حاصل کر کے نہیں نکلتے یہاں انھیں انسانی رشتوں، قدروں اور سماجی، سیاسی واقتصادی پیچیدگیوں سے روشناس کیا جاتا ہے تاکہ وہ معاشرے کی حقیقتوں کے پس منظر میں خود اپنی سوچ پیدا کرسکیں۔اس کے باوجود روشن خیالی اور بائیں بازو کے رجحانات خود ایک مخصوص نظریہ سے وابستہ ہیں لہذا یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ فکر ونظریات سے وابستہ حضرات مخصوص فکر سے وابستگی کے نتیجہ میں مخصوص طرز کی نظام حکومت بھی قائم کرنا چاہتے ہیں۔پھر جو مخصوص نظام حکومت وہ چاہتے ہیں اس کے لیے پنچایت راج سے لے کر ملکی و بین الاقوامی سطح تک وہ سعی وجہد کرتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ وہ کس مرحلہ میں کامیاب ہوں اور کس میں ناکام۔

ابتدائی گفتگو کے بعد جو تین سوالات اٹھائے گئے تھے ان میں سے پہلے اور دوسرے کا جواب یہاں دیا جارہا ہے۔ممکن ہے ان جوابات سے قاری اتفاق نہ کریں، لیکن یہ نا اتفاقی ہی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کا ذریعہ بھی بنے گی۔لہذا اس ڈر اور خوف سے باہر نکل کے کہ مضمون پڑھنے والا ہر شخص چونکہ ممکن ہے ہمارے جوابات سے اتفاق نہ کرے لہذا سوالات ہی نہ اٹھائے جائیں۔برخلاف اس کے سوالات بھی اٹھائے گئے ہیں، جوابات دینے کی کوشش بھی کی گئی ہے اور نا اتفاقی کے نتیجہ میں مزید غور وفکر کے مواقع بھی فراہم کیے جا رہے ہیں۔ضرورت ہے کہ چند لمحہ ٹھہر کر غور وفکر کے بعد ہی گفتگو کو آگے بڑھایا جائے۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ فکر وعمل کی دنیا میں بالعموم جمود نہیں ہوتا۔انسانی تجربات معاشرتی ارتقاء کے باعث قائم شدہ نظریات کے عمل سے گزرتے ہیں اور اس طرح فکری ارتقاء کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔اس

حیثیت میں اگر عمل بمقابلہ فکر سے کیا جائے تو اصل فکر ہے نہ کہ عمل۔لیکن چونکہ عموماً فکر کی عملی تشریح عمل کے ذریعہ ہی دی جاتی ہے۔اور دنیا بھی عمل کے نتیجہ میں فکر کی مثبت و منفی تنقید کرتی ہے۔لہذا ایسے مواقع پر فکر سے زیادہ عمل کی حیثیت ہو جاتی ہے۔پھر چونکہ کسی بھی عملی تحریک کا ایک بڑا طبقہ عملی سرگرمیوں سے وابستہ ہوتا ہے لہذا فکر ثانوی چیز ٹھہرتی ہے۔وہیں عمل یا سرگرمی جو بظاہر نظر آتی ہے وہ مخصوص حالات یا واقعہ کے پس منظر میں انجام دی جاتی ہے۔لہذا مخصوص واقعہ یا حالات سے دلچسپی رکھنے والے افراد ،سرگرمی عمل سے وابستہ ہو جاتے ہیں،اس سے صرف نظر کہ سرگرمی انجام دینے والے کس نظریہ کے حامل ہیں اور اُن کی فکری اساس کیا ہیں۔اس کے باوجود ہر وہ عمل جو پختہ فکر اور شعور سے وابستہ ہو نتائج کے اعتبار سے بہتر نتیجے اخذ کرتا ہے۔برخلاف اس کے فرد واحد یا جماعت سرگرمی انجام دیتے ہوئے نظر تو ضرور آتے ہیں لیکن فکری لحاظ سے پست ہونے کے نتیجہ میں عوام وخواص ہر دو سطح پر طویل مدتی پروگرام کے نفاذ کے دوران مخصوص فکری بنیادوں سے دیگر افراد کو وابستہ کرنے میں ناکام ٹھہرتے ہیں۔وہیں ایسے مواقع پر فرد واحد یا گروہ ہر اس عمل سے وابستگی اختیار کرنے میں ذرا تکلف نہیں کرتا، جو بظاہر اُن ہی جیسی سرگرمی انجام دے رہے ہوں۔یہاں اصل اہمیت سرگرمی یا عمل کو دی جاتی ہے، فکر کو نہیں،لہذا دو متصادم یا دو مخصوص فکر و نظر کے حاملین غیر شعوری طور پر بھی سرگرمیوں میں اشتراک کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔لیکن یہ اشتراک غیر شعوری ہو تو یہی وہ اہم موڑ ہوتا ہے جو نئے حالات اور نئے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔بعض اوقات یہ نئے مسائل اس حد تک مسائل میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ فرد واحد یا گروہ فکری دیوالہ پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔یہ مواقع حد درجہ خطرناک ہوتے ہیں،ایسے مواقع پر ٹھہر کر اور سنبھل کر قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔وہیں وقتاً فوقتاً اپنی سرگرمیوں اور افکار و نظریات سے ہم آہنگی یا دوری کا جائزہ بھی لیا جانا چاہیے۔پھر جس لمحہ بھی محسوس ہو کہ سرگرمیاں ،افکار و نظریات پر حاوی ہو رہی ہیں یا متعلقہ افراد و گروہ کا رخ دوسری جانب موڑ رہی ہیں،اُسی لمحہ ٹھہر کر پرسکون فضا میں غور و فکر کے بعد،اصلاح عمل کی جانب متوجہ ہو جانا چاہیے۔اس موقع پر یہ بھی ممکن ہے کہ سرگرمی جو انجام دی جا رہی ہے،اس کی شدت میں کمی لائی جائے یا ضرورت ہو تو اس سے دوری بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔لیکن یہ بالکل بھی ممکن نہیں ہے کہ مخصوص عمل کے نتیجہ میں فکر سے غفلت برتی جائے۔کیونکہ فکری غفلت ہی فرد اور گروہ کے عقائد،نظریات،معاملاتِ زندگی اور ثقافت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔جس کی بنا پر ایک نیا سیاسی،معاشی اور معاشرتی نظام تشکیل پاتا ہے۔اس پس منظر میں یہ بات بہت اہم ہو جاتی ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان بحیثیت فرد، جماعتیں اور منظم و غیر منظم اداروں کی سرگرمیوں کا بنیادی نکتہ کیا ہونا چاہیے؟ سوال کے جواب میں یہ بات کافی ہونی چاہیے کہ قیام عدل و انصاف کے لیے اپنے نظریہ اور فکر و عقیدے پر قائم ہونے والی عملی عمارت پر عمل درآمد کرتے ہوئے مشترکہ مسائل میں اتحاد کیا جانا چاہیے۔اس سے قطع نظر کہ عدل و انصاف کے قیام کے لیے اشتراک کرنے والا خود کس نظریہ سے وابستہ ہے۔لیکن یہ بات ضرور دیکھنی چاہیے کہ آیا وہ خود ظلم و زیادتیوں میں خود ہی ملوث تو نہیں ہے؟

رہا تیسرا سوال کہ سماجی انصاف کی لڑائی کسی مخصوص فکر و نظریہ کے حاملین کے خلاف ہے یا ہر اس فرد، گروہ اور نظریہ کے خلاف جو ظلم و زیادتیوں میں ملوث ہے؟ اس سوال کا جواب ممکن ہے سیموئیل ہنٹنگٹن کے مضمون میں آپ کو مل جائے۔1993ء میں فارن افیرز جرنل 'نے تہذیبوں کا تصادم ' کے عنوان سے ہارورڈ کے پروفیسر،نیشنل سیکورٹی کونسل کے سابقہ ڈائریکٹر اور امریکی علومِ سیاسیہ ' کی ایسوسی ایشن کے صدر سیموئیل ہنٹنگٹن کا ایک مضمون شائع کیا تھا۔ 1996ء میں ہنٹنگٹن نے اپنے اس مضمون کو کتاب کی شکل دی جو '' تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تعمیر نو '' کے عنوان سے شائع ہوئی۔اس مضمون اور کتاب کی بحث و استدلال اس

مغربی سیکولر اقتدار پر یقین رکھنے کے باوجود اکثر مغربی اقتدار کا متبادل مسلم اقتدار کو سمجھتے ہیں کیونکہ مغربی سرمایہ اور مغربی تہذیب ان کی روایات اور معیارات کے لئے پہلے سے بھی زیادہ تباہ کن بن کر سامنے آئی ہے۔اس امید افزا خیال نے بہت سے مسلمانوں کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ وہ اپنے عوام کے لئے اسلامی اور مکمل اسلامی مستقبل پر زور دیں۔اس طرح کے خیالات میں اگرچہ تمام لوگ اشتراک نہیں کرتے لیکن پھر بھی اتنی تعداد ان نظریات کے ماننے والوں کی موجود ہے جو معاشرے کی لادین قیادت کے لئے ایک مثبت چیلنج بن کر ابھرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

نکتہ کے گرد ہے کہ روس اور امریکہ کی سرد جنگ کے خاتمے کے بعد، دنیا کے لوگوں کے مابین بنیادی امتیازات نظریاتی یا معاشی نہیں بلکہ ثقافتی رہے ہیں۔ جس کے بعد عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر نئے سرے سے استوار کی جارہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں تنازعات اور تعاون کے نئے اسالیب سامنے آرہے ہیں اور یہی سرد جنگ کے موضوعات کی جگہ لے رہے ہیں۔ عالمی سیاست کے نازک مقامات تہذیبوں کی (Faul lines) پر واقع تھے اور خصوصاً عالم اسلام کی حدود پر واقع مقامات عالمی امن کے لئے بہت بڑا خطرہ تھے۔ اس استدلال نے مستقبل کے عالمی نظام کی بحث کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ حقیقتاً اس کو عملی شکل دینے میں اس حد تک مدد بھی ہے۔ اور یہی وہ صورتحال ہے جس کی بنا پر ہنٹنگٹن خود بھی اس صورتِ حال سے پریشان نظر آتا ہے۔

وہیں یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ ایک ہزار سال تک (آٹھویں سے اٹھارہویں صدی کا زیادہ تر حصہ) وسعت اور تخلیقی صلاحیتوں کے اعتبار سے کرۂ ارض کی برتر تہذیب اسلام ' تھا۔ ساتویں صدی میں جزیرۃ العرب میں فجر اسلام کے بعد، مسلمان فوجوں نے ہمسایہ ملکوں کی فوجوں کو شکست دی جس کے نتیجے میں ایک عظیم معاشی اور ثقافتی رابطہ قائم ہوا۔ جس میں مشرق میں چین اور ہندوستان، مغرب میں اسپین اور افریقہ اور اسی طرح مغربی ایشیائی علاقوں کے علم اور اسباب سے مستفید ہونے کی صلاحیت تھی۔ پچھلے دوسو سال میں، اسلام کا عالمی نظام مغربی قوتوں کی زَد میں رہا، سرمایہ داری نے اسے آگے دھکیلا، صنعتی انقلاب اس کی قوت کا باعث بنا اور اسے مغربی روشن خیالی کے انداز میں مہذب بنایا گیا۔ وہ علامتی لمحہ، جب دنیا میں قائدانہ کردار ،مغرب کے ہاتھ میں چلا گیا، 1781ء میں مصر پر نپولین کا حملہ تھا۔ اس وقت سے لے کر مغربی فوجیں اور مغربی سرمایہ مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ آور ہیں۔ ہندوستان، جنوب مشرقی ایشیا، شمال مشرقی اور مغربی افریقہ، وسطی ایشیا اور مغربی ایشیا ان حملوں کی زد میں آئے۔ 1970ء تک فقط افغانستان، ایران، ترکی اور وسطی عرب علاقے مغربی تسلط سے آزاد تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بھی کچھ مغربی اثر کے تحت تھے۔ خلافت، جو کہ مسلمانوں کی علامتی قیادت تھی اور جس کا ناطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا تھا، ختم کردی گئی۔ مسلمان جو کہ کئی صدیوں سے طاقت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل رہے تھے، ان کے لئے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں تھا کہ تاریخ ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

بیسویں صدی کا وسط ،تاریخ کا نیا موڑ تھا اور بیسویں صدی کے بقیہ سالوں میں بھی صورتِ حال میں کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ 1920ء میں جدید ترکی او 1990ء میں وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی کے بعد اب ہم مسلم دنیا کے استعمار سے آزادی کے بارے میں بھی بات کرسکتے ہیں۔ لیکن بہت سوں کے لئے یہ ایک عظیم فتح اور تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے۔ مغربی سیکولر اقتدار پر یقین رکھنے کے باوجود اکثر مغربی اقتدار کا متبادل مسلم اقتدار کو سمجھتے ہیں کیونکہ مغربی سرمایہ اور مغربی تہذیب ان کی روایات اور معیارات کے لئے پہلے سے بھی زیادہ تباہ کن بن کر سامنے آئی ہے۔ اس امید افزا خیال نے بہت سے مسلمانوں کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ وہ اپنے عوام کے لئے اسلامی اور مکمل اسلامی مستقبل پر زور دیں۔ اس طرح کے خیالات میں اگرچہ تمام لوگ اشتراک نہیں کرتے لیکن پھر بھی اتنی تعداد ان نظریات کے ماننے والوں کی موجود ہے جو معاشرے کی لادین قیادت کے لئے ایک مثبت چیلنج بن کر ابھرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی صلاحیت انہیں اقتدار تک پہنچا سکتی ہے بشرطیکہ مسلمان بحیثیت خیر انسانیت اپنا کردار ادا کرنے کے لیے راضی ہوں۔ گفتگو کے اس مرحلے میں یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ مسائل جو درپیش ہیں وہ وقتی ہیں اور حل جو درکار ہیں وہ دیرپا، مسلسل اور منظم ومنصوبہ بند انداز میں انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے انجام دیے جانے والے اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہوں گے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ صورتحال جس کی عکاسی کی گئی ہے وہ دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہے۔ کیونکہ چہار جانب آج سرمایہ دارانہ نظام ایک نئے انداز میں پھر سے حاوہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان بھی اس صورتحال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مختلف ممالک کے مختلف انسٹی ٹیوشن بھی اقدار پر مبنی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ اس پس منظر میں یہ بات بہت اہم ہوجاتی ہے کہ سرگرمیاں جو مثبت تبدیلی کے لیے درکار ہیں وہ مسلسل اور یکساں رفتار کے ساتھ انجام دی جانی ضروری ہیں۔ اس کے لیے بلا رنگ ونسل اور مذہب وذات مل جل کر جدوجہد کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم ہر قسم کے ظلم کے خلاف مظلومین کے ساتھ اشتراک کا رویہ اختیار کریں۔ اس کے لیے ہمیں خود اپنے اندر وسعت قلبی پیدا کرنا ہوگی اور کسی بھی مخصوص فکر ونظریہ کے حاملین کو اپنا حریف بنانے سے گریز کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ جو اسلام کے کٹر مخالف ہیں وہ بھی اگر عدل وانصاف کے قیام میں تعاون و اشتراک کا رویہ اختیار کریں تو ہمارے پاس ان سے دوری بنانے کا کوئی معقول جواز نہیں بنتا۔ لیکن یہ بات لازماً پیش نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے امت کو اس لیے برپا نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی تعداد اور وسائل کے اضافے کی فکر میں مبتلا ہو بلکہ اس کے وجود کا اصل مقصد بھلائیوں کا فروغ اور برائیوں کا ازالہ ہے۔ مزید یہ کہ بھلائیاں کہیں سے بھی سمیٹی جا سکتی ہیں اور برائیاں ہر سطح پر ختم کی جانی چاہئیں، اس حد تک کہ اپنی ذات سے بھی برائیوں کا خاتمہ ہو جائے!

صفدر سلطان اصلاحی

ہمدم و ہم راز

اشہد رفیق ندوی

صفدر بھائی دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، بالکل ویسے ہی جیسے بہت سے لوگ جاتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر میری تسلی کے لیے آج کسی نے غیر فطری اموات کے چند عجیب وغریب مناظر بھیجے ہیں۔ ایک آفیسر میٹنگ کو ایڈریس کرتے کرتے چل بسا، انٹر نیشنل ٹورنامنٹ میں ایک فٹ بال کھلاڑی نے فائنل شارٹ لگائی، گیند گول میں پہونچنے سے پہلے کھلاڑی مالک حقیقی سے جاملا، جیم میں ورزش کرتے کرتے ایک نوجوان ذرا لڑکھڑایا، اور لمحے بھر میں روح پرواز کرگئی۔ سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبد الکلام ایک مخصوص پبلک میٹنگ کو خطاب کرتے کرتے اللہ کی پکار پر لبیک کہہ گئے۔ ان سب واقعات سے سبق ملتا ہے کہ موت کبھی بھی اور کہیں بھی آسکتی ہے۔ اس دنیائے فانی کا اصول ہی نرالا ہے، نہ کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے، نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ بھیجنے والا ہی اپنی مرضی سے واپس بلالیتا ہے۔ اس نے سب کے لیے وقت، جگہ، طریقہ سب متعین کررکھا ہے اور اس کی اصلیت سے بھی صرف وہی واقف ہے۔ لکل امة اجل اذا جاء اجلهم لا يستاخرون ساعة ولا يستقدمون۔ جانے والے بھائی کو اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک تھا، وہ ہمیشہ اس کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کی باتوں میں، نصیحتوں میں، خطابات میں اس کا اکثر ذکر رہتا تھا۔ کیا پتا کب چلے جائیں؟ جو مہلت ملی ہوئی ہے اسے رضائے الٰہی کے حصول میں گزاردینا چاہیے۔ اور بس! یہی ہوا، نماز وتلاوت سے فارغ ہوئے، بیگ اٹھایا دین کی سربلندی کی چاہ میں نکل پڑے اور اپنی مقررہ منزل پر پہونچنے کے بجائے، فرشتوں کے دوش پر سوار ہوکر اس مالک حقیقی کے پاس جاپہونچے جس کی رضا کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

موت کا ظاہری سبب حادثہ بنا۔ صفدر بھائی کرایہ کی کار (UP81-BB6646) سے ادارہ کی مجلس انتظامیہ میں شرکت کی غرض سے مرکز جماعت اسلامی، دہلی کی طرف جارہے تھے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر داہنی طرف صفدر بھائی اور بائیں طرف پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ ۱۸؍فروری ۲۰۱۷ء) صبح آٹھ۔ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ جٹّاری سے پہلے بیرن پورگاؤں، بھٹہ کے پاس مخالف سمت سے آتے ہوئے لوڈیڈ ٹرک (HR-55F9797) سے ٹکر ہوگئی۔ ٹکر بہت شدید تھی۔ دونوں سواروں کو سر میں چوٹ آئی، دونوں بے ہوش ہوگئے۔ صفدر بھائی کا زخم زیادہ شدید تھا۔ جائے حادثہ پر کوئی جاننے والا نہ تھا۔ جٹّاری پولیس چوکی کے لوگوں نے مریضوں کو جیور کے کیلاش ہاسپٹل میں داخل کرایا۔ ڈاکٹروں نے اپنی پوری کوشش کی، محترم ظفر بھائی ہوش میں آگئے، مگر صفدر بھائی کے لیے قدرت کا فیصلہ ہوچکا تھا، وارث، دوست اور خیرخواہان سب کے پہونچنے سے پہلے وہ رخصت ہوچکے تھے۔

اسپتال میں سب سے پہلے صفدر بھائی کا بڑا بیٹا ابوذر پہونچا۔ اس نے فون پر بھرّائی ہوئی آواز میں اطلاع دی ''میں یتیم ہوگیا۔ میں یتیم ہوگیا''، میں جذبات پر قابو نہیں پاسکا، رونے لگا، اس نے ڈھارس بندھائی، آپ ہرگز نہ روئیں، میرے ابو شہید ہوگئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں تھے، وہ دینی سفر پر تھے، اللہ نے انہیں اپنے پاس بلالیا''۔

ہم لوگ ہاسپٹل پہونچے تو ظفر بھائی کی ڈریسنگ

چل رہی تھی اور صفدر بھائی کی نعش مورٹری میں پہونچا دی گئی تھی۔ وہاں سے لے کر علی گڑھ مورٹری پہونچے، پوسٹ مارٹم کی کاروائی یہیں ہونی تھی۔ منظر نہایت دردناک تھا۔ اعزاء، احباب، عقیدت مندان سب میت کے انتظار میں سوگوار کھڑے تھے۔ کسی طرح یہ جانگسل کاروائی مکمل ہوئی تو اب صفدر بھائی کو اس گھر میں داخل کرنے کا مرحلہ تھا، جس کی سلامتی اور بخیریت واپسی کی دعا پڑھ کر صبح روانہ ہوئے تھے۔ آہوں اور سسکیوں کا کہرام تھا، اسید، عدی اور محمد بالکل بے کل تھے۔ بیٹی سہیمہ کے جذبات قابو سے باہر تھے۔ جذبات تو کسی کے قابو میں نہ تھے۔ ہر چہرہ اداس اور ہر فرد مغموم تھا۔ آج احساس ہو رہا تھا کہ صفدر بھائی کتنے عظیم تھے؟ سیکڑوں لوگ میت کے سامنے کھڑے ہیں۔ سب کا الگ الگ احساس ہے۔ کوئی سیرت واخلاق سے متاثر ہے، کوئی خدمت واحسان سے، کوئی علمی گہرائی وگیرائی کی تعریف کر رہا ہے تو کوئی تقوی وطہارت کی شہادت دے رہا ہے۔ تحریکی افراد کے لیے ان کی زندگی کا ہر پہلو نمونہ تھا، مشن کے ساتھ اخلاص، محنت اور بہت محنت، مہلت عمل کو کارآمد بنانے کی فکر۔ پھر قرآن وسنت کا گہرا مطالعہ، تحریکی شعور، مجاہدانہ کردار، مومنانہ فراست، اخوان کے ساتھ حسن سلوک، معاملہ فہمی اور اصابت رائے۔ اس تحریکی مجاہد کی زندگی کا ہر پہلو نمونہ تھا۔ دعوت وجہاد اور عزیمت وشہادت ان کے مطالعہ کے خاص موضوعات تھے۔ تحریکی شہداء سے خاص تعلق محسوس کرتے تھے۔ گزشتہ برسوں میں عالم اسلام پر جو افتاد آئی ہوئی ہے فلسطین، مصر اور بنگلہ دیش میں راہ حق کے جن عظیم مجاہدین کو شہادت حق کے جرم میں شہید کیا گیا، ان کی داستانیں حسرت سے پڑھتے تھے۔ اللہ نے انہیں بھی یہ مرتبہ عطا کر دیا

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

صفدر بھائی کا مدرسۃ الاصلاح میں ساتھ ملا۔ ساتھ کیا ملا؟ دل مل گیا۔ پھر یہ ساتھ کبھی بچھڑا نہیں۔ مدرسہ کے وہ بہت ہونہار طالب علم تھے، ساتھیوں میں بہت مقبول تھے اور استادوں کو بھی عزیز تھے۔ تحریکی لٹریچر پڑھنے کا شوق گھر سے لے کر آئے تھے۔ ان کے والد جناب سلطان احمد مرحوم تحریک کے بے لوث سپاہی تھے، ان کی رگ وریشے میں تحریکیت رچی بسی تھی، اس کی خوشبو سے بچوں کے اذہان وقلوب کو خوب خوب معطر کر رکھا تھا۔ صفدر بھائی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ مدرسہ پر حرکت ودعوت ان کی پہچان تھی۔ مدرسہ سے امتیازی نمبرات سے فراغت کے بعد علی گڑھ تشریف لائے، شعبۂ عربی سے ایم اے پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ محنتی اور ہونہار تو تھے ہی جی آر ایف کوالیفائی کیا اور اسکالرشپ کے حق دار ٹھہرے۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ شعبہ میں ریسرچ ایسوسیٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر دو تحریکی اداروں درس گاہ اسلامی رامپور اور اقراء پبلک اسکول علی گڑھ نے بھی تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے ان کی خدمت حاصل کیں۔ اس کے بعد دوبارہ وہ مادر علمی علی گڑھ کے آغوش میں آ گئے۔ لیکچرر اور ایسوسیٹ پروفیسر کے مراحل طے کرنے کے بعد چار ماہ قبل پروفیسر کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کئی اعتبار سے ان کی خدمات کی جولان گاہ بنی۔ اجمل خاں طبیہ کالج کا شعبہ کلیات تدریسی فرائض کے لیے مقدر ہوا تو اکیڈمک کونسل کی رکنیت حاصل کر کے یونیورسٹی کے تعلیمی امور میں رہنمائی کی، اساتذہ کی تنظیم کے ممبر منتخب ہوئے تو وہاں اپنی اصول پسندی، غیر جانبداری اور حق گوئی وبے باکی کی مثال قائم کی۔ معروف ومقبول استاد ہونے کی وجہ سے باہر کے لوگ بھی ان سے استفادہ کی شکلیں تلاش کرتے۔ کوئی ممتحن کی حیثیت سے مدعو کرتا، کوئی ایکسپرٹ کی حیثیت سے بلاتا۔ جہاں جاتے حسن اخلاق اور ایمان داری کی چھاپ چھوڑ آتے، ذاتی قدر ومنزلت میں اضافہ کے ساتھ یونیورسٹی کے وقار میں بھی اضافہ ہوتا۔

یونیورسٹی کے در و بست ان کی دعوتی تڑپ کے بھی گواہ ہیں۔ کیمپس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوگا جہاں دعوتی غرض سے ان کے قدم نہ پہونچے ہوں، شاید ہی کوئی دیوار ہو جس پر ان کے نام اور دستخط کے پوسٹر نہ لگے ہوں، یونیورسٹی کا چپہ چپہ گواہ ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد دین کی سرفرازی تھا۔ کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر اور کبھی اسکوٹر پر سوار یہ شخصیت ہر دم رواں پیہم دواں نظر آتی۔ کبھی درس دینا ہے، کبھی تقریر کرنی ہے، کبھی ملاقات، کبھی مریض کی عیادت، کبھی پریشاں حال کی داد رسی اور کبھی یونیورسٹی انتظامیہ کو ان کی خطاؤں پر متنبہ کرنا ہے۔ ان کے پاس اسٹاف کلب کی خوش گپیوں، ڈپارٹمنٹ کی سازشوں، کیفے کی چایوں اور کسی گروپ میں شامل ہو کر وی سی کی حمایت یا مخالفت کرنے کا وقت نہ تھا۔ ان کا مشن بہت عظیم تھا۔ جس کو وہ دل سے عزیز رکھتے تھے، اس کا ثبوت نماز جنازہ کے دلدوز مناظر نے دیا۔ کون تھا جو موجود نہ رہا ہو۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری تمام سرگرمیوں کو موقوف کر کے ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے اور نماز جنازہ پڑھائی، حلقہ کے ذمہ داران مرادآباد سے آئے، اس کے علاوہ میرٹھ، ہاپوڑ، غازی آباد، بدایوں، بریلی، لکھنؤ اور اعظم گڑھ سے بڑی تعداد میں تحریکی رفقاء شریک ہوئے۔ یونیورسٹی کا اپنا غم تھا، اس کا ہونہار فرزند اور لائق خادم رخصت ہو رہا تھا، پوری یونیورسٹی انتظامیہ، اساتذہ، طلبہ، اعزاء واحباب کی بڑی تعداد نماز جنازہ میں شریک ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ جنازہ گاہ کی جگہ تنگ اور مٹی کم پڑ گئی۔

کیا شخص تھا جو راہِ وفا سے گزر گیا
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

یونیورسٹی استاد کی پہچان تدریس وتحقیق سے ہوتی ہے۔ پڑھاتے تو طلبہ کا دل جیت لیتے، تحقیق کے لیے قلم اٹھاتے تو تحقیق کا حق ادا کر دیتے۔ صفدر بھائی نے تدریس وتحقیق دونوں میں نام کمایا۔ طلبہ کے ہر بیچ نے ان کی ایمان داری اور محنت ومشقت کی شہادت دی،

جومضامین ان کے ذمہ تھے،طلبہ کوان میں دلچسپی کم ہی ہوتی ہے،مگرصفدر بھائی کا دلنشیں اسلوب تدریس،مفید مواداوراصول پسندی طلبہ کوکلاس تک کھینچ لاتی اورطلبہ گرویدہ ہوجاتے۔زیردرس مضامین میں بحث وتحقیق کی گنجائش بھی بہت کم تھی۔انہوں نے تحقیق کے لیے زبان وادب اورتحریک وسماج کو موضوع بنایا، ان موضوعات پر جوتحقیقی مضامین لکھے علمی دنیا میں ان کی زبردست پذیرائی ہوئی۔خاص طور سے مصری ادب کے مختلف گوشوں کوانہوں نے اجاگر کیا۔مصری لٹریچر میں قدامت پسندی سے بغاوت اور آزادی کی جستجو نے قاری کے اندر اسلامی قدروں سے نفرت پیدا کردی تھی۔ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے جمال الدین افغانی اور اخوانی قائدین کی تحریروں کے حوالے سے قدرمشترک تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قرآنیات ان کا پسندیدہ موضوع تھا جومدرسۃ الاصلاح سے نسبت کی وجہ سے ان کے دل ودماغ میں سمایا ہوا تھا۔ قرآنیات پر کئی شاہکار مضامین لکھے جو علوم القرآن اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے۔گزشتہ سال ان قیمتی مضامین کے مجموعے بھی کتابی صورت میں منظر عام پر آگئے جو ان ناقدین کی غلط فہمی دور کرنے کا سبب بنے جوانہیں صرف دین کا مجاہد سمجھتے تھے،قلم کا غازی نہیں۔ انہوں نے ۳۶ معیاری مضامین رقم فرمائے جوموقر رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کی چار کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔متعدد قومی وبین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کی اورخود ایک مہتم بالشان بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا۔یہ تحقیقی وتصنیفی سرمایہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے گراں قدر علمی ورثہ چھوڑا ہے۔امر واقعہ ہے کہ کاغذی تصنیف ان کی ترجیحات میں کبھی شامل نہیں رہی، رجال کار تصنیف کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا،حسن البناء شہید کی طرح صفدر بھائی بھی افراد کے دلوں پر ایمانی حمیت ومحبت رقم کرنے کا کارنامہ انجام دیتے رہے، آج جو ہزاروں افرادنوحہ کناں ہیں، دراصل یہ وہی افراد ہیں جن کے دلوں میں انہوں نے ایمان کی محبت،قرآن کی قدردانی، سیرت نبوی سے لگاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے مرمٹنے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔

یہ سچائی ہے صفدر بھائی کی اصل پہچان تحریکی مجاہد کی تھی، ماں نے دودھ کی پہلی چسکی اور باپ نے پہلی چمکار کے ساتھ ان کے اندر تحریک کی ایسی روح پھونکی کہ زندگی کا ہر لمحہ اس خوشبو سے مہکتا رہا۔ مدرسۃ الاصلاح میں اسی شعور کے ساتھ داخل ہوئے۔عربی دوم وسوم سے بزم خطابت میں شامل ہونے لگے۔فریضہ اقامت دین وشہادت حق ان کا پسندیدہ موضوع ہوتا،اس زمانے میں وہ اتنے تیار ہوگئے تھے اوران کے ذہن ودماغ میں موضوع ایسا رچ بس گیا تھا کہ کوئی بھی موضوع دیا جاتا وہ گھوما کر اپنے موضوع پر لے آتے اورزبردست تقریر کرتے۔ایک مرتبہ بزم خطابت کے ذمہ داروں نے خوب سوچ سمجھ کر ان کے لیے ''اسلام اور مستشرقین'' موضوع مقرر کیا تاکہ وہ اپنے پسندیدہ موضوع تک نہ پہونچ سکیں۔صفدر بھائی نے تقریر شروع کی،تحریک استشراق اور اس کی دسیسہ کاریوں کا تذکرہ کرنے کے بعد اقامت دین کی راہ میں اس تحریک کے خطرات بیان کرنے پر آگئے اور منتظمین اپنی ناکامیوں پر مسکرانے لگے۔مدرسہ میں قیام کے دوران ایس آئی او وجود میں آئی،فوراً اس کے ممبر بن گئے،علی گڑھ تشریف لائے تومسلم یونیورسٹی یونٹ کے ذمہ دار منتخب ہوئے، پھر CAC،ZAC ، صدر حلقہ یوپی مغرب اور جنرل سکریٹری تک کی حیثیت میں ایس آئی او کو بنایا سنوارا۔ایس آئی او میں رہتے ہی جماعت کی رکنیت اختیار کرلی۔ پھر جماعت کے مقامی ذمہ دار بنادیے گئے۔اپنے دورامارت میں مقامی جماعت کو بہت مضبوطی عطا کی۔ نئی نئی سرگرمیاں شروع کیں۔ممبران وکارکنان کی تعداد میں اضافہ، اسلامک انفارمیشن سینٹر اور لائبریری کا قیام، فری ڈسپنسری اور مقامی جماعت کے لیے دومنزلہ عمارت کی تعمیر سب صفدر صاحب کے نامۂ اعمال کا حصہ ہیں۔انہوں نے سالانہ بین المذاہب سمپوزیم، سالانہ میڈیکل کیمپ اورنمائش گراؤنڈ پر دعوتی کیمپ کی طرح ڈالی اور مضبوطی سے اس نظام کو چلاتے رہے۔کیمپس کے اندر مسجد نور کا ماہانہ اجتماع بہت اہتمام سے منعقد کراتے جو جماعت کے فکر اور نام دونوں کو آگے بڑھانے کا بہت مؤثر ذریعہ بنا۔ جماعت کا شعبہ خدمت خلق بھی ان کے زمانے میں مثالی کردارادا کرتا رہا۔ ہرسال کئی لاکھ روپے مقامی طور پر جمع کراتے اور بچوں کی تعلیم، مریضوں کے علاج،غریبوں کی امداد اور بے روزگاروں کو روزگار دلانے میں صرف کرتے۔مقامی سطح سے اوپر اٹھ کر صفدر بھائی حلقہ کی مجلس شوریٰ کے رکن، فلاح عام سوسائٹی کے نائب صدر، مرکزی مجلس نمائندگان کے ممبر اور کئی مرکزی کمیٹیوں کے رکن رکین تھے۔مشاورتی نشستوں میں وہ پوری تیاری کے ساتھ شریک ہوتے اوراعتماد کے ساتھ اپنا موقف رکھتے۔ ان کا تحریکی وژن بالکل کلیر تھا اورمطالعہ اتنا پختہ کہ نشستوں میں ان سے آگے کوئی نہ نکل پاتا،کئی بار مکالمہ بہت طویل ہوجاتا مگر انہیں کوئی اپنے موقف سے نہ ہٹاپاتا۔تحریکی پالیسیوں میں وہ قدیم روایات اوراصول پرکاربند تھے۔ہواکے رُخ پر موقف بدلنے کے سخت خلاف تھے۔انتخابی سیاست میں شمولیت پر کئی بار ان کے دلائل کو سننے کا موقع ملا۔اپنے موقف پر اتنا شرح صدر تھا کہ کوئی انہیں قائل نہ کرپایا۔ساتھ ہی وہ اتنے اصول پسند تھے کہ اپنے ہی موقف کے خلاف کوئی فیصلہ ہوجاتا تو اس کا نفاذ مکمل شرح صدر کے ساتھ کرتے، اس میں ان کی پسند وناپسند حارج نہ ہوتی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تحریک کے بہت بے لوث اور باشعور خادم تھے۔تحریک ہی ان کا اوڑھنا،بچھونا اورتحریک ہی ان کی پہچان تھی۔مشن کی لگن اورکام کی دھن ان کی زندگی کا خاصہ تھا بالآخر مشن ہی کی راہ میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

صفدر بھائی مختلف اداروں سے بھی وابستہ رہے۔

ادارہ علوم القرآن اور ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی سے خاص تعلق تھا۔ ادارہ علوم القرآن کی تمام مجالس کے رکن رکین اور ایک میقات میں خازن رہے۔ ادارہ کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے اور بڑھ چڑھ کر تعاون کرتے، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کے سکریٹری تھے۔ تمام انتظامی امور ان کے ذمہ تھے، جب انہوں نے ادارہ کا چارج لیا اس کی ظاہری حالت بہت خستہ تھی، اپنے مشفق ومربی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی سے انسپائر ہوکر انہوں نے ادارہ کی نشاۃ ثانیہ کی ٹھان لی۔ پھر کیا تھا؟ ادارہ میں امنگ وترنگ کی گونج سنائی دینے لگی، خطیر رقم کا انتظام کیا اور دو نئے پلاٹ خرید کر رقبہ میں اضافہ کرایا۔ قدیم بوسیدہ عمارت کی تجدید کے ساتھ ایک نئی منزل تعمیر کرائی اور ایک عالی شان مسجد کا کیمپس میں اضافہ کیا، جو آج اپنے محسن کی خدمات کو سلام پیش کر رہے ہیں۔ صفدر بھائی ادارہ تحقیق کے ظواہر کو سجانے میں اچھی طرح کامیاب ہوئے، ان کی شدید خواہش تھی کہ اس کا علمی وقار بھی بلند ہو، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا محمد فاروق خاں اور مولانا سید جلال الدین عمری نے اپنی معیاری تحقیقات ونگارشات سے ادارہ کی جو پہچان بنائی ہے، وہ پہچان واپس ملے۔ اس وقار کی جستجو میں کئی تلخ وشیریں واقعات بھی تاریخ میں رقم ہوگئے مگر وہ اپنی یہ حسرت دل ہی میں لے کر چلے گئے۔ ان کا آخری سفر بھی اسی ادارہ کی سرگرمیوں کو منظم کرنے اور تقویت دینے کے لیے تھا۔ مگر ان کی مہلت عمل مکمل ہوچکی تھی، وہ بہت سے منصوبے ناتمام چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ افراد چلے جاتے ہیں ادارے باقی رہ جاتے ہیں۔ دعا ہے کہ ادارہ کو ایسا جانشین مل جائے جو ان کی باقیات کو باقی رکھ سکے اور ان کے ناتمام خوابوں کو نئی تعبیر دے سکے۔

صفدر بھائی چلے گئے ان کے لیے مہلت عمل بس اتنی ہی تھی۔ اپنے پیچھے ایک پر بہار خاندان جس میں ۵ عاقل، بالغ اور باشعور بیٹے، ایک بیٹی، اہلیہ، ۳ بھائی اور ۵ بہنیں شامل ہیں، سب سوگوار ہیں۔ سوگواروں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو ان کی عنایات کے زیر سایہ پلے بڑھے، دین کا شعور حاصل کیا اور دین کے خادم بنے۔ پورا تحریکی کارواں بھی سوگوار ہے کہ اس نے اپنا بےلوث خادم، بے باک ترجمان اور عظیم قائد کھودیا ہے۔ اخبارات وسوشل میڈیا پر ہزاروں افراد جدائی کے غم میں نڈھال نظر آرہے ہیں۔ دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں کے چہرے بھی مرجھائے ہوئے ہیں، ان کے بہت ہی عزیز دوست ایاز احمد اصلاحی صاحب جو پہلے سے بے حد رنجیدہ ہیں۔ دو ماہ کے اندر بیوی اور ماں کا صدمہ پا چکے ہیں، دوست کی جدائی کی خبر سن کر بے ساختہ کہہ اٹھے کہ یہ میرے لیے تیسرا صدمہ ہے۔ اور یہ غم میرے بھائی کی جدائی کے غم جیسا ہے۔ محترم ایاز بھائی کی تسلی کے لیے ماشاء اللہ چار حقیقی بھائی زندہ سلامت ہیں۔ میرا کوئی حقیقی بھائی نہیں ہے، صفدر بھائی میرے اکلوتے بھائی تھے، وہ مجھے بھی داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ اللہ سب پر رحم فرمائے۔ اللہ مجھ پر بھی رحم فرمائے۔ آمین۔

جناب صفدر سلطان اصلاحی مرحوم

ڈاکٹر محمد رفعت

رفیق محترم جناب صفدر سلطان اصلاحی صاحب کا پچھلے دِنوں ایک سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا جب وہ علی گڑھ سے دہلی جا رہے تھے۔ اُن کو ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ وہ اس تحقیقی ادارے کے سکریٹری تھے اور بڑی توجہ کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اُن کی مغفرت فرمائے، اُن کے درجات کو بلند کرے، اُن کی خدمات اور اعمالِ صالحہ کو قبول فرمائے، اُن کے احباب اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔

صفدر صاحب نے تعلیم کے ابتدائی مراحل مدرسہ اصلاح اعظم گڑھ میں طے کیے۔ آپ کے علمی ذوق اور دلچسپی کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ نے اس ادارے سے بخوبی استفادہ کیا اور وہاں کے فاضل اساتذہ کے اچھے شاگرد ثابت ہوئے۔ انتقال کے وقت صفدر صاحب کی عمر صرف پچاس سال تھی اور ابھی چند ماہ پیش تر ہی آپ پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ اس سے قبل آپ خاصے عرصے تک ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکے تھے۔ آپ کا تعلق مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبہ علم الادویاء سے تھا۔ یونیورسٹی میں آپ ایک معروف شخصیت تھے اور آپ کا دائرۂ تعارف وسیع تھا۔

صفدر صاحب کو دینی مزاج اپنے والد صاحب سے ورثے میں ملا تھا جو جماعت اسلامی ہند کے رکن

تھے۔صفدر صاحب زمانہ طالب علمی ہی میں طلباء کی تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (SIO) سے وابستہ ہوگئے تھے۔آپ نے تنظیم کی سرگرمیوں میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا چنانچہ تنظیم کی ذمہ داریاں بھی آپ کے سپرد کی گئیں۔ مناصب پر خدمات انجام دینے کے علاوہ آپ اہم مجالس کے رکن بھی رہے۔ یہ تحریکی تجربات طالب علمی کے بعد کی آپ کی زندگی کے لیے سرمایہ ثابت ہوئے۔طلباء تنظیم ہونے کی بنا پر SIO کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہے۔معمول کے کاموں کے علاوہ بڑی سطح کے اجتماعات کا انعقاد ہوتا رہا ہے جن کے دیرپا اثرات مسلمان طلباء اور وسیع تر سماج پر پڑے ہیں۔ اس طرح مختلف موضوعات کے تحت مہمات کا اہتمام بھی ہوتا رہا ہے۔ایک باشعور اور فعال کارکن ہونے کی بنا پر صفدر صاحب ان سب مہمات اور اجتماعات میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔اُن کے دائرہ تعارف میں اُن کی شخصیت کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ کسی تنظیم کے کام کے وسیع ہونے میں اُس کے کارکنوں کا رول کلیدی ہوتا ہے۔منصوبوں میں رنگ اُن کی کوششیں ہی بھرتی ہیں۔صفدر صاحب اس لحاظ سے مثالی کارکن تھے۔

دورِ طالب علمی کی تکمیل کے بعد جناب صفدر صاحب جماعت اسلامی ہند کے رکن بنے۔ SIO کے پس منظر کے مطابق جماعت کے اندر فعال رول عین متوقع تھا۔آپ ان توقعات پر پورے اترے۔علی گڑھ کی مقامی جماعت کی امارت کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی۔آپ نے وسیع روابط قائم کیے، زیرِ ربط افراد میں دینی جذبہ پیدا کیا اور بہت سے مخلص اشخاص کو جماعت کے قریب لائے۔تنظیمی سرگرمیوں میں اپنے رفقاء کو متحرک کیا اور متنوع پروگراموں کی حوصلہ افزائی کی۔ جماعت اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے کے مطابق مقامی جماعتوں کے علاوہ علاقوں کا نظم بھی قائم کیا گیا ہے۔ ہر علاقے میں کئی مقامی جماعتیں اور حلقہ ہائے کارکنان شامل ہوتے ہیں۔حلقہ یوپی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر ''یونیورسٹی ایریا'' کو ایک تنظیمی علاقہ قرار دیا۔صفدر صاحب اس علاقے کے ناظم علاقہ مقرر کیے گئے نظامت کی ذمہ داری کے دوران آپ نے منصوبہ بند طرز پر جماعتی کام کو منظم کیا۔ جماعت کے ذمہ دار کی حیثیت سے آپ نے طلباء کی اسلامی سرگرمیوں کی سرپرستی فرمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ دینی مزاج کے حامل اساتذہ میں صفدر صاحب کی شخصیت معروف تھی۔ یونیورسٹی کے ماحول میں جماعت کے تعارف میں وسعت آپ کی تگ ودو کا نتیجہ ہے۔

صفدر صاحب اپنے دینی وعلمی ذوق کی بنا پر ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ کے اساسی رکن بنائے گئے اور ادارے کے سکریٹری بھی مقرر ہوئے۔ادارہ کا اہم کام طلباء کی تربیت ہے تاکہ وہ اسلامی موضوعات پر تحقیق کرسکیں اور تصنیف وتالیف کا کام بھی کریں۔ طلباء کے علاوہ، محققین بھی ادارے سے وابستگی اختیار کرتے ہیں اور اُن کی تخلیقی کاوشوں کے نتائج سامنے آتے ہیں۔اپنی تدریسی وتحریکی مصروفیات کے باوجود صفدر صاحب پابندی کے ساتھ ادارہ تحقیق کے دفتر آتے اور ادارے کے کاموں کی ہر پہلو سے نگرانی کرتے تھے۔آپ نے ادارے میں علمی خطبات کا بھی اہتمام کیا اور تحقیقی امور میں مشورے کے لیے علی گڑھ میں موجود اہلِ علم ودانش کا تعاون حاصل کیا۔ طلباء کے کام پر آپ نگاہ رکھتے اور ضروری ہدایات دیتے۔ ادارے کے انتظامی امور کی بہتر انجام دہی کے لیے آپ نے مسلسل دوڑ دھوپ کی اور ادارے کے اخراجات کی تکمیل کے لیے اہلِ خیر حضرات کو توجہ دلائی۔ان کوششوں کے نتیجے میں دفتر ادارہ کی عمارت میں توسیع ہوئی اور ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی۔ادارے کی آپ کی خدمت ایک صدقہ جاریہ ہے اور اللہ کے کرم سے توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے گا۔اب آپ کے رفقاء کا کام ہے کہ ادارہ کو اسی طرح متحرک رکھیں اور اس کے کام میں مزید پختگی ووسعت لائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملتِ اسلامیہ کے روشن مستقبل کی ضمانت ایسے مخلص اہلِ علم ودانش ہیں جو علم وتحقیق کے ساتھ میدانِ عمل میں بھی متحرک ہوں۔ صفدر صاحب ایسے ہی باعمل انسان تھے۔نئی نسل کے لیے اُن کی زندگی بڑی سبق آموز ہے۔اُن کے لیے دعائے خیر کے ساتھ، مسلمان نوجوانوں کو کوشش کرنی چاہیے کہ جہدِ مسلسل کو اپنا شعار بنائیں اور بزرگوں کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کریں۔تب ہی غلبہ حق کی وہ منزل قریب آسکتی ہے جس کا خواب اصحابِ عزیمت دیکھتے آئے ہیں۔

انتخاب

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے فکر وخیال کی آزادی ہو، اس کی جان، اس کی عزت وآبرو اور مال محفوظ ہو، اس نقطۂ نظر سے آپ اسلام پر نظر ڈالیں گے تو ان حقوق کے ادا کرنے میں اسلام کا سینہ دنیا کے دوسرے دنیوی ومذہبی نظاموں سے زیادہ کشادہ نظر آئے گا۔ اگر آپ ایک طرف یونائیٹڈ نیشن (UNO) کا منشور پڑھیں اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج یعنی حجۃ الوداع کا خطبہ پڑھیں تو ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔

اسلام بے سوچے سمجھے کسی کو ماننے پر مجبور نہیں کرتا، حتی کہ بنیادی عقائد توحید وآخرت جن کو اصول مسلمہ کی طرح مان لینا چاہیے، ان کے لیے بھی اسلام عقلی دلائل فراہم کرتا ہے۔اسلام ہر شخص کو دنیا میں اس بات کی آزادی دیتا ہے کہ وہ صراط مستقیم پر چلتا رہے یا غلط عقیدہ قائم کرکے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا پھرے، بہرحال اس دنیا میں اسے کوئی نظریہ یا عقیدہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

شہر کے درمیان سڑک پر ہلکے ہلکے قدموں سے میں چلا جا رہا تھا، نہ جانے کہاں جانا تھا، مجھے خود بھی نہیں پتا تھا۔ میں کیوں اس سڑک پر چل رہا تھا اور یہ سڑک کہاں جاتی تھی، مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ آس پاس کے سارے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں ہر کوئی مصروف تھا۔ حتٰی کہ مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیوں مصروف ہیں۔ ماحول بھی خوشگوار تھا لیکن مجھ پر ماحول کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ نہ ماحول مجھے پسند ہی آ رہا تھا اور نہ ہی میں اسے ناپسند کر پا رہا تھا۔ میں بس یوں ہی بلا وجہ چلا جا رہا تھا۔ چلتے ہی چلتے اچانک میری آنکھیں کسی خوبصورت شئے سے ٹکرائیں۔ میں اس طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ شئے مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے میں اس کی خوبصورتی میں کھوتا چلا گیا۔ میرا دل اس کی طرف مائل ہونے لگا، اور ہوتا بھی کیوں نہیں۔ نہ تو میرے پاس کوئی دلیل ہی تھی کہ میں اس سے نظر ہٹا سکوں اور نہ ہی کوئی دوسری منزل، کہ اس منزل کی خوبصورتی اس شے کی خوبصورتی پر پردا ڈال سکے۔ اب دھیرے دھیرے میرے قدموں میں تیزی آنے لگی۔ میں جلد سے جلد اس شے کو حاصل کرنے کا خواہش مند ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں اس راستے آیا ہی اس شئے کے لیے تھا۔ مانو، میری منزل ہی یہی بن گئی، اور اب میں اس شے کو حاصل کرنے میں پوری کوشش کرنے لگا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا وہ شے مجھے اور بھی عزیز ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے اس راہ میں آگے بڑھتا گیا مجھے رکاوٹیں محسوس ہونے لگیں۔ کبھی راستے میں بڑے بڑے پتھر آ جاتے تو کبھی راستہ ہی ہموار نا ہوتا۔ کبھی افراد کی بھیڑ لگ جاتی تو کبھی کوئی اور بھی اسی شئے کو حاصل کرنے کے لیے ساتھ چلنے لگتا۔ غرض ایسا محسوس ہونے لگا سارے لوگ اسی شئے کو حاصل کرنے سے مجھے روکنے میں مصروف ہیں۔ اب مجھے ماحول بھی ناپسند لگ رہا تھا۔ جیسے یہ بھی اس لیے خوشگوار تھا کہ میں اس میں گم ہو کر اس شے کی خوبصورتی بھلا دوں۔

کہتے ہیں انسان کے پیر میں جتنی بھاری بیڑیاں ہوتی ہیں اسے اتنا زیادہ اڑنے کا شوق ہوتا ہے۔ لہٰذا جتنا مجھے رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اتنا ہی اس شئے کو حاصل کرنے کی چاہت مجھ میں بڑھتی جا رہی تھی۔ بہر حال بہت ہی کوششوں کے بعد میں اس جگہ پہنچ ہی گیا جہاں وہ خوبصورت شئے موجود تھی۔ لیکن وہاں پہنچ کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں تو ایسا کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ خوبصورت شئے جس کی طرف میرا دل مائل ہو گیا تھا وہ کہیں بھی نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف کافی تلاش کیا لیکن مجھے ناکامی ہی ملی۔ آخر کار میں مایوسی میں دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور یہ سوچنے لگا کہ آخر میں یہاں آیا ہی کیوں، وہ کیا شئے تھی جو مجھے یہاں کھینچ لائی، جس کے پیچھے میں بنا سوچے سمجھے یہاں تک چلا آیا۔ میں اپنے آپ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ آخر میں اس کی خوبصورتی میں کیسے ڈوب گیا؟، اور وہ کیا عنصر تھا جو مجھے اسکی خوبصورتی میں غرق کرتا چلا گیا؟۔ کیا اسی طرح کی دوسری کوئی بھی خوبصورت شئے کی طرف میں یوں ہی مائل ہو جاؤں گا؟۔ اور کیا ہر خوبصورت شے یوں ہی لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں اور پھر اسی طرح غائب ہو جاتی ہے؟۔۔۔ اور پھر رہ جاتی ہے تو صرف مایوسی۔۔۔۔۔۔

میں اسی طرح کی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میرا الارم بجا اور میں ہکا بکا اٹھ بیٹھا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، میں انتہائی تکلیف میں کسی طرح الارم بند کرنے میں کامیاب ہوا۔ الارم بند کرتے ہوئے میری نظر موبائل میں آئے ہوئے ایک پیغام پر پڑی۔ میں نے اسے پڑھا تو وہاں علامہ اقبال کا ایک شعر تھا، اس شعر کو پڑھتے ہی میرے ہواس بے قابو ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے میرے اس خواب کا علم اسے بھی ہے جس نے مجھے یہ شعر بھیجا ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟۔۔۔۔ بہر حال اس شعر نے میرے بہت سے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔۔۔۔۔۔

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز گرمیِ محفل نہ کر قبول

انس شیخ
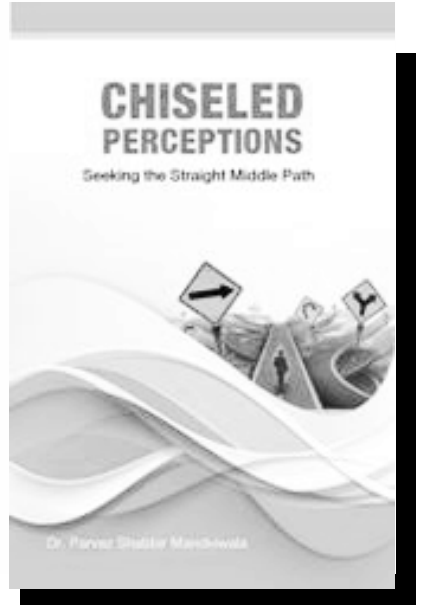
تلاشِ ذات سے
منزلِ خودآگہی تک

ڈاکٹر پرویز مانڈوی والا کی انگریزی کتاب Chiseled Perceptions یعنی خودساختہ تصوراتِ حیات، ایک آپ بیتی ہے۔حق کی تلاش میں سرگرداں ایک ایسے نوجوان کی مختصر داستانِ زندگی جو بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس نوجوان کی خوبی یہ ہے کہ وہ سوچتا ہے، غوروفکر کرتا ہے۔سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رب کائنات نے ہر فرد بشر کو عطا کی ہے اور لوگ اس کا استعمال بھی کرتے ہیں مگر اس کا دائرۂ کار مادی فائدہ ونقصان تک محدود ہوتا ہے۔ یعنی ایک بیش بہا نعمت سے نہایت ہی معمولی کام لیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص مکھی کو مارنے کیلئے ٹینک کا استعمال کرے یا ہیرے جواہرات کا قیمتی ہار پیاری بلی کے گلے میں ڈال کر اپنے محبوب کو ناراض کردے وغیرہ۔ بقول اقبال۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

یہ بیدار مغز نوجوان بلا کا ذہین ہے اور اس کے غوروفکر کا میدان حق و باطل کے درمیان فرق کرنا ہے۔ وہ ہر شئے کو اس کسوٹی پر ناپتا ہے اور صحیح کو غلط سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا دل عصبیت سے پاک ہے اس لئے وہ ہر خیر کو بلا تامّل قبول کرلیتا ہے بیجا عقیدت سے پاک خداداد معقولیت پسندی کے سبب غلط بات سے کنارہ کشی میں وہ پس وپیش نہیں کرتا۔ حوصلہ مندی کی صفت اس سے مشکل فیصلے بہ آسانی کرواتی چلی جاتی ہے اور وہ بفضل تعالیٰ خودآگہی کی منزل پر اعتماد و اطمینان کے ساتھ پہنچ جاتا ہے۔ زندگی کے اس دلچسپ سفر میں اس کا سابقہ مختلف لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے اور وہ مختلف انداز میں اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سفرنامہ کا خوبصورت پہلو مشیت کی کرشمہ سازیاں ہیں جو قدم قدم رہنمائی کرتی ہیں مثلاً سید حسن صاحب کا ایک خاص مقام پر اور زندگی کے اہم موڑ پر اتفاقاً ملنا اور پھر اوجھل ہوجانا وغیرہ۔

اس کتاب کے دو باتیں قابل توجہ ہیں اول تو یہ ہے کسی بھی اجتماعیت کے تئیں اگر اس سے وابستہ افراد کے اندر شدت پسندی پیدا ہوجائے تو وہ داعی، مدعو اور اجتماعیت تینوں کیلئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سے لوگ قریب آنے کے بجائے دور چلے جاتے ہیں اور یہ مرض کیہ طرح کا بھید بھاؤ نہیں کرتا مثلاً مچھر کی ایذا رسانی کسی تفریق و امتیاز کی قائل نہیں ہوتی۔ کسی عقیدہ یا جماعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے ان تمام لوگوں کو جو اپنے دین سے محبت کرتے ہیں اور اس کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے اپنی ذات کا جائزہ لے کر سوچنا چاہئے کہ ان کے کون کون سے اعمال مخاطب کو قریب کرنے والے ہیں اور کن حرکات سے وہ دور ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ دوسرا اہم سبق یہ ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ معاشرے کے باصلاحیت نوجوانوں کے علمبردار بن جائیں تو یہ کام زور زبردستی و دھونس دھمکی یا بہلانے پھسلانے و دھوکہ فریب سے ممکن نہیں ہے۔ ہر انسان اپنی منزل پر خود پہنچتا ہے دیگر حضرات اس کا تعاون اسی قدر کرسکتے ہیں جتنا کہ وہ چاہتا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے اس کے غوروفکر کے عمل کو متحرک کرنے کی سعی کریں۔ اگر وہ سوچنا سمجھنا شروع کردے تو آفاق وانفس میں پھیلے ہوئے شواہد اس کو دین فطرت کی جانب ازخود متوجہ کرنے لگیں گے۔ اس کے ذہن میں جنم لینے والے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کیلئے حسبِ طلب گفتگو اور کتابوں کی فراہمی کارآمد ہوسکتی ہے۔ جب وہ عملی میدان میں کام کرنے پر آمادہ ہوجائے تو اجتماعیت کو چاہئے کہ اس کو مواقع فراہم کرے اور اس کے تربیت وتزکیہ کا اہتمام کرے۔ باقی سارا کام اس کا اپنا ہے اور کے سبب ملنے والی فلاح ونجات بھی اس کے اپنے لئے ہے۔ یہی معرفت وخودآگہی کامیابی شاہِ کلید ہے بقول اقبال۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عام طور پر سوانح عمر کے آخری حصے میں قلمبند کی جاتی ہیں لیکن ڈاکٹر پرویز مانڈوی والا کی بے چین طبیعت نے ان کو اجازت نہیں دی کہ وہ ایک کارِ خیر کو بلاسبب موقوف کریں اور اپنے قارئین کو انتظار کے کرب میں مبتلا کریں۔ آپ بیتی کا ایک عیب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ طول طویل اور مبالغہ آمیز ہوتی ہے لیکن یہ کتاب ان نقائص سے پاک ہے۔ اس میں ایک بھولا بھالا نوجوان جو کبھی گھر میں تو کبھی اسکول میں نظر آتا ہے۔ وہ کالج میں پہنچنے کے بعد مختلف جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس میں انفرادی، ازدواجی اور اجتماعی زندگی کی دلچسپ جھلکیاں ہیں۔ کتاب کی عمدہ زبان اور روانی ایسی ہے کہ قاری اس کو شروع کردینے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں پاسکتا لیکن چونکہ کتابچہ مختصر ہے اس لئے نہ انتظار کی طوالت محسوس ہوتی اور نہ وہ طبیعت پر بارِ گراں محسوس ہوتی ہے۔ میں تہہ دل سے اپنے نوجوان دوست ڈاکٹر پرویز مانڈوی والا کو ان کی پہلی تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''۔

نام کتاب: آب حیات (ناول)
مبصر: مبشر الدین فاروقی

اللہ رب العزت نے زندگی کو ہمہ رنگ، متنوع بنایا ہے اور یہی تنوع اس کی خوبصورتی ہے۔ ان معنوں میں کہ انسان کی زندگی صرف ایک پہلو پر مشتمل نہیں ہوتی اور نہ ہی حالات و واقعات یکساں ہوتے ہیں۔ عمر کا ہر دور خاص قسم کے احوال رکھتا ہے اور مخصوص چیلنجز کا حامل ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنی استعداد کے اعتبار سے لازماً ان صورتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی بھی مایوس نہ ہوتے ہوئے اعتماد، عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنا خوشگوار کامیاب زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ عمیرہ احمد کا ناول "آب حیات" زندگی کے ان چیلنجز کا سامنا کرنے کی کہانی ہے۔ یہ مصنفہ کے مشہور ناول "پیر کامل" کا دوسرا حصہ ہے۔

پیر کامل کی کہانی سالار اور امامہ کے لمبے عرصے بعد اتفاقی طور پر دوبارہ ملنے پر ختم ہوئی تھی۔ یہیں سے آب حیات کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ "آب حیات" ایک شادی شدہ جوڑے (سالار اور امامہ) کی شادی کے بعد کی زندگی، اس کے مختلف ادوار، ہر دور کے مختلف چیلنجز اور ان چیلنجز کا سامنا کرنے کی کہانی ہے۔ ناول مکمل طور پر ان دونوں کے درمیان ہی گھومتی ہے لیکن اس کے ذریعے معاشرہ کی صورتحال اور اس کے مختلف چیلنجز کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

سودی نظام کی نحوست اور ہلاکت خیزی ایسے شخص کو جو غیر معمولی ذہانت اور صلاحیتوں کا حامل ہے، اس وقت realize ہوتی ہے، جب اِس کی وجہ سے اس کا اپنا خاندان خطرے کا شکار ہوجاتا ہے۔ تمام تر اسباب و وسائل اور کوششوں کے باوجود اپنی بے بسی اسے بے چین کردیتی ہے اور اس نظام سے لڑنے کا عزم پیدا کرتی ہے۔ یہ لڑائی بالکل بھی آسان نہیں ہے لیکن وہ تمام رکاوٹوں کو عزم وحوصلہ کے ساتھ عبور کرتا ہے۔ سالار کے اس کردار اور جدوجہد میں motivation کا عنصر موجود ہے۔

دلچسپی اور تجسس سے بھرپور اس ناول میں دین داری کے مروجہ تصور اور اس کے نقصانات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ معاشرہ میں ایسا طبقہ موجود ہے جو اپنے آپ کو بہت "دیندار" سمجھتا ہے۔ یہ لوگ بنیادی فرائض کی سختی سے پابندی کرتے ہیں لیکن ان کی نماز زندگیوں میں عاجزی اور انکساری کو پیدا نہیں کرتی۔ ترش روی، سخت گوئی ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ یہ افراد چونکہ دین کے مزاج، اس کی روح سے واقفیت نہیں رکھتے اور دین کا محدود تصور رکھتے ہیں اس لیے یہ اسلام سے نا آشنا افراد کے سامنے دین کی غلط تصویر پیش کرنے کی وجہ بنتے ہیں۔ ان کا رویہ منافقت پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ یہ حسب موقع اپنے فائدے کے اعتبار سے رویے کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

ناول سے ایک پیغام یہ ملتا ہے کہ محبت میں پائیداری اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک اس میں اعتبار شامل نہ ہو۔ اعتماد کے بغیر کی جانے والی محبت عام حالات میں قائم رہ سکتی ہے لیکن جب کوئی مشکل موقع پیش آئے تو اس کی مضبوطی متاثر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بتائی گئی کہ کسی خلاف طبیعت واقعہ یا ناقابل تلافی نقصان کے بعد مستقل اپنے آپ کو غم کی کیفیت میں مبتلا رکھنا، درحقیقت کفران نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے ہم ان لوگوں کو اذیت پہنچاتے ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات سے زندگی رک نہیں جاتی بلکہ صبر کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناول کے بارے میں ایک احساس یہ ہے کہ پیش کیا گیا کردار سالار سکندر چونکہ نہایت غیر معمولی (Extraordinary) صلاحیتوں والا شخص ہے اس لیے وہ غیر معمولی کام بھی کرسکتا ہے۔ وہ عالمی طاقتوں اور اس نظام سے ٹکر لے سکتا ہے اور انہیں چاروں خانے چت بھی کرسکتا ہے۔ لیکن یہ تصور عام افراد سے relate نہیں ہو پاتا۔ "آب حیات" ان کے لیے محض ایک کہانی ہوسکتی ہے جس میں چند اسباق اور عزم وحوصلہ کے حوالے سے تحریک ہے لیکن اس میں عملی اعتبار سے پیش کیا گیا ماڈل بہت زیادہ relevant نہیں ہے۔

کہانی طویل ہے اور ممکن ہے یہ طوالت کچھ لوگوں کو پسند نہ آئے اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ واقعات کا تنوع یا کہانی کا مختلف سمت میں پھیلا ہونا قارئین کو عجیب لگے۔ لیکن جیسے شروعات میں عرض کیا گیا کہ زندگی مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے اور یہی اس کی خوبصورتی ہے۔ ان مختلف پہلوؤں کو ایڈریس کرنا ہی آب حیات کا خاصہ ہے۔

روایتی انداز سے ہٹ کر لکھے گئے اس ناول میں ویسے تو کئی جملے خاص ہیں اور دلوں کو اپیل کرتے ہیں لیکن بالخصوص ناول کے آخری جملے کو نقل کرتے ہوئے بات ختم کروں گا۔

'بے شک طاقت کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے جس کی محبت وہ آب حیات ہے جو زندگی کو دوام بخشتا ہے اس دنیا سے اگلی دنیا تک'۔

''نیٹ'' امتحان میں اردو کی شمولیت کیلئے ایس آئی او کی پیش رفت

168<0

O IS INCLUDED IN NEET BUT NO PLACE FOR 168

O = NO. OF KANNADA MEDIUM SCIENCE COLLEGES
168 = NO. OF URDU MEDIUM SCIENCE COLLEGES

#SelectiveDiscrimination

Students Islamic Organisation of India

میڈیکل کورسس، ایم بی بی ایس اور بی ڈی ایس میں داخلے کے لئے اس سال سے کل ہند سطح پر منعقد کیا جانے والا امتحان نیٹ (نیشنل ایلیجبلٹی کم انٹرنس ٹیسٹ) انگریزی اور دیگر ۹ علاقائی زبانوں میں ہوگا، جس میں اردو شامل نہیں ہے، جبکہ 168 سے زائد اردو میڈیم جونیئر کالجس موجود ہیں اور چالیس ہزار سے زائد طلبا بذریعہ اردو تعلیم حاصل کرتے ہیں، جو ملک کی چھٹی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا ،سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اور شعبۂ وزارت صحت کے اس غیر ذمہ دارانہ فیصلے پر پہلے تو ایس آئی او آف انڈیا نے ان اداروں میں اور ان کے ذمہ داران سے ملاقاتیں کر کے براہ راست درخواستیں جمع کیں، مگر متعدد درخواستوں کے باوجود نیٹ کا جو نوٹیفکیشن جاری کیا گیا اس میں ہنوز اردو والوں کو محروم رکھا گیا۔ اس ضمن میں ایس آئی آف انڈیا نے قانونی لڑائی شروع کی اور ماہ فروری کے اواخر میں ایک رٹ پٹیشن دائر کی، اور عدالت عالیہ سے درخواست کی گئی کہ چونکہ نیٹ کا فارم پُر کرنے کی حتمی تاریخ 1 مارچ ہے لہٰذا عدالت اس پٹیشن پر ہنگامی سنوائی کرے۔ مگر عدالت نے درخواست رد کرتے ہوئے 3 مارچ کو پٹیشن پر سنوائی کی تاریخ دی۔ اس دوران ایس آئی او نے متعلقہ اداروں سے حتمی تاریخ کو آگے بڑھانے کی درخواست بھی کی، جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں رہا۔

پہلی سنوائی میں میڈیکل کاؤنسل اور مرکزی وزارت صحت کو عدالت کی جانب سے وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا گیا۔ ایس آئی او کی نمائندگی کر رہے وکیل روندر گریا اور پرویز دباس نے عدالت کو بتایا کہ مرکزی شعبہ اور متعلقہ اداروں کا یہ فیصلہ دستور ہند کی دفعہ 14 اور 21 کے صریح منافی ہے۔

عدالت عالیہ کے نوٹس کے جواب میں اگلی تاریخ یعنی 10 مارچ کو شعبہ مرکزی حکومت نے بتایا کہ 16 نومبر کو ریاستی وزرا سے اس سلسلے میں ہوئی نشست میں کسی بھی ریاستی وزیر نے اردو کی نمائندگی نہیں کی لہٰذا اردو کو شامل نہیں کیا گیا، بعد ازاں نوٹیفکیشن جاری ہونے کے بعد درخواستیں دی گئیں۔ مرکز نے یہ بھی واضح کیا کہ آئندہ سال سے نیٹ کو اردو میں منعقد کرنے کے لئے تیار ہے۔ استغاثہ کے اسی سال نیٹ کو اردو میں کرنے بحث پر عدالت نے مرکز کو اپنا حلف نامہ داخل کرنے کے لئے کہا ہے اور اگلی سنوائی کے لئے آئندہ 24 مارچ کی تاریخ مقرر کی ہے۔

ایس آئی او آف انڈیا کے مرکزی سیکریٹری توصیف احمد نے بتایا کہ حالانکہ نوٹیفکیشن جاری ہونے سے قبل ہی مہاراشٹرا اور تلنگانہ ریاستوں کی جانب سے میڈیکل کاونسل کو درخواست دی جا چکی تھی۔

سچر کمیٹی سفارشات کا سماجی محاسبہ

2005 میں بھارت کے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کی ہدایات پر مسلمانوں کی معاشی، سماجی و تعلیمی حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے سابق چیف جج ڈاکٹر راجندر سچر کی قیادت میں ایک کمیٹی بنام ''سچر کمیٹی'' تشکیل دی گئی تھی۔ 20 مہینوں کی مدت میں اپنی تحقیقات کے نتائج اس کمیٹی نے حکومت کے سامنے پیش کئے اور مسلمانوں کی سماجی ومعاشی پسماندگی کی بنیاد پر ان کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی غرض سے اپنی سفارشات پیش کیں۔ سچر کمیٹی رپورٹ کے 10 سال مکمل ہونے پر اس کا جائزہ لینے کی غرض سے ایس آئی او آف انڈیا کی جانب سے ایک پروگرام بعنوان ''سچر کمیٹی کے دس سال: ایک سماجی محاسبہ()'' کا انعقاد کیا گیا۔ مہمانان میں سید سعادت اللہ حسینی (نائب امیر، جماعت اسلامی ہند)، ڈاکٹر ظفر محمود (صدر زکوۃ فاؤنڈیشن)، پریم سنگھ (پروفیسر، دہلی یونیورسٹی) اور خلیق احمد (ایس آئی او آف انڈیا کے جنرل سیکریٹری) شامل رہے۔ پروگرام کی ابتدا تلاوت قران سے ہوئی۔ بعد ازاں پروفیسر پریم سنگھ نے بتایا کہ وقتاً فوقتاً سچر سفارشات سوائے معدودے چند کے تقریباً تمامی ہی سیاسی پارٹیوں کے منشور کا حصہ رہے لیکن ان پر عمل درآمد شاید دس فیصد ہی رہا، کیونکہ معروضی نہج پر مسلم ایشوز کے حوالے سے سوچنے اور سوال کرنے والوں کی اس دور میں کمی رہی ہے جس کی وجہ سے اکثریتی طبقہ کے دباؤ نے سیاست دانوں کو اس سے روکے رکھا۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکار پر ان سفارشات کے نفاذ کے لئے دستور ہند کے حوالے سے دباؤ بنایا جائے تا کہ اقلیتی طبقہ تحفظ، مساوات، تکریم اور اپنے مذہبی تشخص کے ساتھ قائم رہ سکے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ظفر محمود صاحب نے ان سفارشات کے نفاذ پر مبنی ایک پریزنٹیشن دیا اور واضح کیا کہ بہت بڑی حد تک خلا اب بھی باقی ہے، حد یہ ہے کہ ریاستی وقف بورڈ کی سرپرستی کے لئے اکثر مسلمان نامزدگان سامنے نہیں آتے۔ اس کے بعد جناب سعادت اللہ حسینی صاحب کی اختتامی گفتگو رہی۔